# فتنہ سامانیٔ دل

کشور ناہید

سنگِ میل پبلی کیشنز ۰ چوک اُردو بازار ۔ لاہور

## ضابطہ


بار اوّل ——— ۱۹۸۵ء

تعداد ——— ایک ہزار

پبلشر ——— نیاز احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

پرنٹر ——— منظور پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— ۰۰/۲۱۰ روپے

# حرفِ دگر

رمز و ایما کی روایتوں کا ایک انبار ہے کہ اس میں بیان کا خلوص اور بات کا اثر، دونوں گھٹ کر رہ گئے ہیں۔ اور جب یہ دیکھیں کہ جو کچھ شعر جیسے نازک اور مؤثر پیرائے میں کہا جا رہا ہے، اس کا مرکز کون ہے، مخاطب کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے، تو پھر اُردو غزل کے معتدبہ سرمائے کے سلسلے میں بڑی مشکل پڑتی ہے۔

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غزل کا بڑا سرمایہ ان تعیّنات سے عاری ہے۔

غزل کی سی صنف کا تقاضا یہ ہے کہ تعیّنات کی آئینہ گری پورے وثوق اور ذمّے داری سے کی جائے، کیونکہ غزل کے شعر کو ایک مخصوص معنی کے علاوہ معانی کے کچھ اور افق بھی چمکانے ہوتے ہیں۔ اور یہ افق، بدلتے رہتے ہیں، کبھی ہر قاری کے ساتھ، کبھی زندگی کے نئے تقاضوں کے ساتھ، کبھی انسانی الجھنوں کے نئے نئے موقع محل کے ساتھ۔

اگر یہ نہ ہو تو غزل کے اشعار ہر ہر عہد میں زندہ نہ رہیں۔

اصل یہ ہے کہ ان تعیّنات کی حدیں تو نہیں، البتہ ان کا سیاق و سباق ضرور متعین ہو سکتا ہے، یعنی سمجھنے سمجھانے کی خاطر، یہ متعیّن ہو سکتا ہے کہ ان تعیّنات مالہٗ، اور ماعلیہ کیا ہے۔

پہلی بات تو ہے کہ غزل کا شاعر، شعورِ خویشتن سے بہرہ ور ہو، وہ جان سکتا ہو کہ مجھے، جو غزل کا شعر کہنا ہے تو کیوں اور کس لیے کہنا ہے، اور غزل کے جملہ سرمائے کے حوالے سے میری ذات کا تعیّن کیسے ہو سکتا ہے، دوسرا شعور، شعورِ دیگرے کا ہے،

اس شعور کے کئی پہلو ہیں؛ ——

یعنی اس شخص کی پہچان کہ جس کی بدولت، دل میں جذبات کا کوئی ہیجان برپا ہُوا، ان جذبات

نے ایک خاص نہج اختیار کی، اور ان جذبات نے، کچھ تجربات، کچھ واقعات، کچھ معاملات اور پھر کچھ محاکات کے جامے پہنے۔ رمز و ایما کی روایتوں میں یہ شعورِ دیگرے، جاناں اور غمِ جاناں میں محدود کر دیا جاتا ہے۔

لیکن وہ مسائل اور وہ معاملات جن سے زندگی اور زمانہ عبارت ہیں وہ سوچ، جو زندگی کے ورا اور ماورا کے بارے میں، ہر ہر قرن، انسان کی صنم گری کا محور اور مسجود رہی ہے، وہ بھی تو اسی شعورِ دیگرے کے اس نور، اس اجالے میں جب تک اپنے آپ کو دیکھا نہ جائے۔ اپنی ذات کا کوئی تعین ہو نہیں سکتا۔ ماحول و فضا، نسل و ثقافت کے یہی حوالے ہیں، جن کے ذریعے، ذات کا تعین ہوتا ہے، اور ہم ایک خاص زمانے میں رس بس کر، اس میں سانس لے کر، اپنے سے پہلوں کی اور اپنے معاصروں کی اور غالباً اپنے سے بعد میں آنے والوں کے شعر میں ماضی، حال اور آئندہ کے کوئی افق روشن کر سکتے ہیں۔

یہ ساری بات اس لیے کہی گئی ہے کہ "لبِ گویا" کی جب پہلی چھاپ سامنے آئی تھی، تو یہ "شعورِ خویشتن" لگ بھگ ہر غزل میں موجود تھا ——— لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ تمنّا کا صرف ایک قدم ہے، اور تمنّا اگر شعورِ خویشتن کی منزل کو جان لے، تو پھر اس کا کوئی دوسرا قدم بھی ہوتا ہے۔ غالب نے شعورِ خویشتن کی اسی منزل کو، اپنے لازوال شعر میں ناپ لیا تھا، اور اسے "دشتِ امکان" کی اصطلاح میں قید کر دیا تھا، پھر یہ فریاد بھی کی تھی کہ

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب

تمنّا کا دوسرا قدم یہ ہے:

شاہدِ ثانی، شعورِ دیگرے

خویش را دیدن، بنورِ دیگرے!

یعنی یہ اپنے ادراک کا دوسرا مرحلہ ہے، یہ اپنی ذات کے علاوہ ایک پورے مرحلۂ ادراک کا احاطہ ہے کہ اس مرحلے میں اپنے وجود کے ساتھ ساتھ کسی ایک وجہ کی ہمراہی اور اس کی حضوری

کا احساس ہوتا ہے، کبھی وہ کوئی ہم نفس ہوتا ہے، ان معنوں میں ہم نفس کہ جس کی آرزو ہر صاحبِ معنیٰ کو رہی ہے، کبھی کوئی دوست اور ہم سخن کبھی محبوب، کہ ان احساسات کا وہی مرکز ہے، اور یہ احساسات کی جتنی بھی وابستگی ہے، وہ اسی کی بدولت ہے۔

ایک اور سطح پر شعورِ دیگرے کے اس مرحلے میں وہ سارا زمانہ، سارا ماحول اور روحِ عصر شامل ہے وہ ساری فضا اور اس کے ذہنی میلانات اور ہیجانات احاطہ گیر ہیں جو شاعر کے زمانے میں موجود ہوتے ہیں اس کا تہذیبی ورثہ اور پس منظر بنتے ہیں، اس کی اخلاقی اور سوشل روایات کہلاتے ہیں اور اس کی زندگی مخصوص دائرہ عمل اور دوسری زندگیوں کے متقابل اس کے ردِ عمل سے عبارت ہیں۔

'لبِ گویا' کی اس دوسری چھاپ میں جو نئی غزلیں شامل ہیں، وہ اسی شاہدِ ثانی، اسی شعورِ دیگرے کے چند دیگوں کا آئینہ ہیں۔ اب جو بات کہی جاتی ہے، اس کے لہجے میں زیادہ وثوق اور تیقن ہی نہیں، بلکہ معنیٰ کی تہوں کے اعتبار سے لہجہ اور (الفاظ کا مجموعہ یعنی لغت) اختیار کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے آپ دیکھیں گے ایک طرف شاعرانہ بیان اتنا سادہ ہے کہ:

وہ شخص جس کی آنکھ ہے بے رنگ، بے طلب
پہلے پہل ملا، تو بہت مہرباں لگا!

اور ساتھ ہی ساتھ ساری توجہ اس بات پر ہے کہ اپنے شعور اور دیگراں کے شعور کے سلسلے میں جو کچھ واردات ہیں جو کچھ بھی دیکھا اور جھیلا ہے، جو کچھ بھی تفکرات یا تردد ہیں جو کچھ بھی دل و ذہن پر متجلّی ہوا ہے، اس کے لیے ایک مخصوص پیرایہ اختیار کیا جائے۔

مخصوص پیرایہ ان معنوں میں یہ نئی غزلیں، اپنی پیشرو غزلوں کے حوالے سے محض تسلسل روایت ہی نہیں، اپنی پہلی روایات میں، مزعومات میں، اور اندازوں میں کئی طرح سے اضافہ کرتی ہیں۔ ایک وجہ تو صاف ظاہر ہے کہ اب اپنی ذات کا تعین، دیگراں کے سیاق و سباق میں ہو رہا ہے، اس لیے مضامین کا دائرہ اور دائرہ کار دونوں وسیع تر ہو گئے ہیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ شخص اور

شاعر اور عورت (کہ وہ خویشتن سے موسوم تھے) کو اب اتنا خیال اپنا نہیں، جتنا دیگراں کی ذیل میں شمار ہونے والوں کا ہے۔ چنانچہ اب امیجری کا دائرہ وسیع تر ہے، لفظوں اور ترکیبوں کی تراشں پر توجہ زیادہ ہے، لہجے میں گھلاوٹ ہی نہیں، تفکر بھی ہے اور دل سوزی بھی۔ کیونکہ بات کا رس، بات کی تہ اور تہ آرائش، لہجے کا تفکر اور دل سوزی اسی وقت آتی ہے، جب صرف اپنا ہی نہیں، دوسروں کا خیال رکھنا پڑے اور بالخصوص یہ فکری فرض بھی ادا کرنا ہو، سرِّ دلبراں کو حدیثِ دیگراں کے پیرائے میں کہنا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اب فریاد صرف اتنی ہی نہیں رہی کہ:

اہلِ دل آؤ سنو تو ہم بھی افسانہ کہیں
کچھ دہانِ زخم کھولیں جورِ جاناں نہ کہیں

کی نئی نئی تہیں، ان غزلوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں، مثلاً:

چشمِ سنگ آلود کو بھی واقفِ دید و شنید
جنگلوں سے جھانکتی پانی کی عریانی کرے

---

اندیشہ ہائے گفتنی، ناگفتنی کے بیچ
ہنستے ہیں جام قحطِ قدح خوار دیکھ کر

---

ہجومِ عکس میں چہرے تلاش کیسے کریں
ہر ایک شکل، اساسِ غلط نکلتی ہے

---

بیکار، شرحِ لفظ و معانی سے فائدہ
جب تُو نہیں تو شہر میں تجھ سا کہاں سے آئے

آگہی کی ان راہوں سے کئی راہیں نکلتی ہیں، یہ شاعر کی شخصیت اور اس کے سرمایۂ فکر کی راہیں

ہیں، لیکن بات اتنی ہی نہیں ہے، ان غزلوں کے تفکّر اور تشخّص پر، خودشناسی کے لیے ریاضت کی ایسی فضا چھائی ہے جس کا سرنامہ یہ ہے:

بہ وصولِ مقصدِ عافیت، نہ دلیل جُو، نہ عصا طلب
تو زاشک آں ہمہ کم نۂ، قدمے ز آبلہ پا، طلب

مختار صدّیقی

# لبِ گویا

عمر در شعر بسر کرده و در باخته ام
عمر در باخته را، بار دگر باخته ام
عرفی

✺

نہ کوئی ربط بجُز خامشی و نفرت کے
ملیں گے اب تو خلاصے یہی محبّت کے

مَیں قیدِ جسم میں رُسوا، تُو قید میں میری
بدن پہ داغ لیے قیدِ بے صعوبت کے

عجیب بات گریباں پہ ہاتھ اُن کا ہے
جو توشہ گیرِ تمنّا تھے حرفِ غیرت کے

بس اب تو حرفِ ندامت کو ثبتِ دائم دے
صبا صفت تھے رسالے غمِ محبّت کے

دُعا سے تزکیۂ نفس تک، سفر ہے بہت
لباس بدلو گے کتنے بھی اب ضرورت کے

سیہ، سفید کے مالک کو فرقِ رنگ سے کیا
پڑے نہ اس پہ بھی صدمے کبھی ہزیمت کے

زمامِ کارِ جہاں کس کے ہاتھ ہے یارب
بدل گئے ہیں تقاضے بھی آدمیّت کے

زمانہ درپئے آزار ہے تو کیا ناہید
بکھرتے آئے ہیں موتی سدا مشقّت کے

سنبھل ہی لیں گے، مسلسل تباہ، ہوں توسہی
عذابِ زیست میں رشکِ گناہ، ہوں توسہی

کہیں تو ساحلِ نا یافت کا نشاں ہو گا
جلا کے خود کو تقاضائے آہ ہوں توسہی

مجال کیا کہ نہ منزل بنے نشانِ وفا
سفیرِ خود نگراں، گردِ راہ ہوں توسہی

صدا بدشت بنے گی نہ یہ لہو کی تپش
لہو کے چھینٹے مگر گاہ گاہ ہوں توسہی

ہے رات کھولے ہوئے بال، دلفگار کہ اب
طلوعِ صُبح کے آثارِ راہ ہوں تو سہی

خود اپنے عکس سے نالاں پھریں گے یہ خودبیں
فریب و مکر، مجسّم پناہ ہوں تو سہی

یہ خود فریبیٔ احساسِ دلبری ہے سُراب
مقامِ حشر ہو۔ باہم گواہ ہوں تو سہی

---

٭

اپنے لہُو سے نام لکھا، غیر کا بھی دیکھ
زندہ ہے تو شقاوتِ دشتِ بلا بھی دیکھ

آنکھوں کے آئینوں کا تو پانی اُتر گیا
اب جسم چوبِ خشک ہے یہ سانحہ بھی دیکھ

ہوتی ہے زندگی کی حرارت رگوں میں سرد
سُوکھے ہُوئے بدن پہ یہ چمڑا کسا بھی دیکھ

بے تابیوں کو سینے کے اندر سمیٹ لے
فتنے کو اپنی حد سے مسلسل بڑھا بھی دیکھ

ہر ذرّہ عبرتوں کے سمندر کی شکل ہے
صحرا نوردِ شوق کبھی نقشِ پا بھی دیکھ

پہچان اپنی ہو تو ملے منزلِ مُراد
ناہیدؔ گاہے گاہے سہی، آئینہ بھی دیکھ

---

٭

ٹھہرے تو ہر سفر، سفرِ رائیگاں لگا
ہر اختیار، حاصلِ وہم و گماں لگا

رنجِ طلب کی کوئی نشانی نہ بن سکی
ہر رشتۂ اُمید بھی آشوبِ جاں لگا

پھیلا کچھ اس طرح شفقِ شام کا فسوں
پُر ہول دشت، قریۂ بے آسماں لگا

آنکھوں میں سوئی خواہشیں جاگیں تو جسم بھی
ساکت سمندروں پہ کھُلا بادباں لگا

وُہ شخص جس کی آنکھ ہے بے رنگ، بے طلب
پہلے پہل ملا تو بہت مہرباں لگا

دیکھا اسے تو اپنی گلی بھی بھلی لگی
بے رنگ آئینوں کا سماں ارغواں لگا

اونچی چھتوں کے شوق نے توڑا فسونِ شوق
خاکستری زمیں کی طرح آسماں لگا

خواہش سکوں کی شوقِ جراحت مسل گئی
ہر شخص آئینے کی طرح بے زباں لگا

✻

صلیبِ درد، سخن دارِ جستجو بھی ہو
نِگہ اُٹھے تو کوئی میرے رُوبرو بھی ہو

دِلوں کا عقدہ کسی طور تو کُھلے ہم پر
تعلّقِ غمِ جاں، واقفِ عدُو بھی ہو

چراغِ بزمِ شب ایجاد بُجھ ہی جائے گا
دریدہ پیرہنی، واقفِ لہُو بھی ہو

کبھی سفر تو کریں اپنی سمت دیوانے
یہ موجِ ساحلِ پایاب تُند خُو بھی ہو

حساب لے مرا ہمزاد، قرضِ ناخن کا
پلٹ کے دیکھوں تو خود سے ہی گفتگو بھی ہو

مجالِ آئینہ، تابِ حریف پہچانے
ہو ہم کلامی خود ایسے جیسے تو بھی ہو

سروں پہ اوندھے توے کی طرح فلک موجود
کوئی الٹ کے یہ ترتیب سُرخرُو بھی ہو

خُدا کرے کہ مرا لختِ دل جواں ہو کر
مزاجِ دہر سے واقف ہو جنگجُو بھی ہو

---

✺

دِل بُجھ گیا ہے زِشت کو مختار دیکھ کر
لب سِل گئے سلاسلِ اظہار دیکھ کر

شعلہ ہے دل تو جل بھی بجھے، سرد بھی تو ہو
پھُونکے ہمیں نہ رونقِ عیّار دیکھ کر

رُکتی ہے سانس، قدغنِ اظہار کے سبب
بڑھتے ہیں دام، شوقِ خریدار دیکھ کر

اندیشہ ہائے گفتنی، ناگفتنی کے بیچ
ہنستے ہیں جام قحطِ قدح خوار دیکھ کر

لرزو نہ پانیوں میں پڑے عکس کی طرح
پیچھے ہٹو نہ سطوتِ آزار دیکھ کر

---

٭

حدّتِ جوشش و طلب چہروں کی ویرانی کرے
خوف سے مبہُوت ، آنکھوں کی ہُنر دانی کرے

حرف کی زنجیر میں بھی اب کھنک باقی نہیں
یک قلم منظُور ہے جو کچھُ پریشانی کرے

آنکھ کی پُتلی میں ٹھہرے پانیوں کی لُو نہ ہو
یہ ستم ایجاد حسرت ، جلوہ سامانی کرے

رفتگاں کی یاد ، منزل کے دلاسے کتنی دیر
کب تلک خوابِ وفا ، جذبوں کی مہمانی کرے

آسماں کا زہر، تپتی دھوپ کی صُورت بہے
خون کی کالی نسوں میں شعلہ سامانی کرے

چشمِ سنگ آلُود کو بھی واقفِ دیدو شنید
جنگلوں سے جھانکتی پانی کی عُریانی کرے

مثلِ برگِ خشک ہے، آسیب آسا زندگی
اس طرح کوئی نہ جوشش وخوں کی ارزانی کرے

---

پہن کے پیرہنِ گُل صبا نکلتی ہے
سیاہیوں کے جگر سے ضیا نکلتی ہے

کبھی تو مجھ کو بھی احساسِ آشنائی دے
وہ روشنی جو کفِ گُل پہ جا نکلتی ہے

مَیں آنکھ بند کروں تو بھی ہے وُہی منظر
وہ ایک شکل ہر اِک رہ پہ آ نکلتی ہے

سرابِ فہم سے آگے کہیں ہے بحرِ مُراد
ہر ایک منزلِ دارا نقشِ پا نکلتی ہے

کبھی جو کھل کے کروں بات اپنے آپ سے میں
ہر ایک آرزو غم آشنا نکلتی ہے

ہجوم عکس میں چہرہ تلاش کیسے کریں
ہر ایک شکل اساس خلا نکلتی ہے

سرک رہے ہیں اندھیرے ہر ایک بستی سے
عذاب ابر سے قوس وفا نکلتی ہے

مرے یقیں کی گھٹن اور بھی بڑھے ناہید
ہوا ہو بند تو موج بلا نکلتی ہے

---

✺

بیمار ہیں تو اب دمِ عیسٰے کہاں سے آئے
اُس دِل میں دُردِ شوق و تمنّا کہاں سے آئے

بیکار شرحِ لفظ و معانی سے فائدہ
جب تُو نہیں تو شہر میں تُجھ سا کہاں سے آئے

ہر چشمِ سنگِ کذب و عداوت سے سُرخ ہے
اب آدمی کو زندگی کرنا کہاں سے آئے

وحشت ہوس کی چاٹ گئی خاکِ جسم کو
بے در گھروں میں شکل کا سایہ کہاں سے آئے

جڑ سے اُکھڑ گئے تو بدلتی رُتوں سے کیا
بے آب آئینوں میں سراپا کہاں سے آئے

سایوں پہ اعتماد سے اکتا گیا ہے جی
طوفاں میں زندگی کا بھروسہ کہاں سے آئے

غم کے تھپیڑے لے گئے ناگن سے لمبے بال
راتوں میں جنگلوں کا وہ سایہ کہاں سے آئے

ناہیدؔ فیشنوں نے چھپائے ہیں عیب بھی
چشمے نہ ہوں تو آنکھ کا پردا کہاں سے آئے

---

✺

سُرخی بدن میں رنگِ وفا کی تھی کچھ دنوں
تاثیر یہ بھی اُس کی دُعا کی تھی کچھ دنوں

ڈھونڈے سے اس کے نقش اُلجھتے تھے اور بھی
حالت تمام کرب و بَلا کی تھی کچھ دنوں

کاغذ پہ تھا لکھا ہُوا ہر حرف، لب کُشا
تحریر، جسم، صوت و ادا کی تھی کچھ دِنوں

شاخوں پہ کونپلوں کو زبانیں عطا ہُوئیں
یہ دلبری بھی دستِ صبا کی تھی کچھ دنوں

دِل سوزئ وفا کو شکیبائی کی عطا
شائستگی یہ رنگِ حنا کی تھی کچھ دنوں

اب ہے کدورتوں کا کھلا دشت اور میں
چاہت تمام تیری رضا کی تھی کچھ دنوں

کیفیتِ نشاط تھی خود ہی سے گفتگو
ناہید یہ رِدا بھی حیا کی تھی کچھ دنوں

✺

ہنستے چہروں کو بھی ڈس جاتی ہے اُلجھن کیسے
دیکھ لو ہو گئے ویراں، بھرے آنگن کیسے

موسمِ برگِ خزاں آئینہ دکھلاتا ہے
راکھ ہو جاتا ہے، ہر جسم کا ایندھن کیسے

پارۂ ابر سے سُورج کی کرن رُکتی نہیں
شوقِ بیتاب کو روکے گی یہ چلمن کیسے

آتے جاتے ہوئے بادل سے تو سایہ نہ بنے
کوئی ٹھہرے نہ تو چمکے بھلا آنگن کیسے

قہقہے، ضبط کی دیوار پر گُلکاری ہیں
داغ رکھے ہیں چھُپا کے تہِ دامن کیسے

جب ٹھہرتا ہی نہیں، رنگ نہ موسم کوئی
عمر بھر کے لیے رکھیے بھی تو بندھن کیسے

دیکھ کے آئینہ ناہیدؔ یقین آتا ہے
حدّتِ رنگ سے جل جاتے ہیں گُلشن کیسے

---

غموں کی جلتی چِتا تھیں جوانیاں اپنی
بزعمِ خویش تھیں تازہ کہانیاں اپنی

خمارِ شوق نہ تھا شب کے گنبدوں پہ رقم
نژادِ شبنم و گُل تھیں نشانیاں اپنی

مِلے جو تم سے مُلاقات ہوگئی خود سے
ستیزِ عجز تھیں، شعلہ فشانیاں اپنی

ہر ایک لفظ تھا منسوب جو کسی نے کہا
نہ کام آئیں کبھی بے زبانیاں اپنی

خمارِ رنج سے آتش زدہ تھے گیسو بھی
زوالِ شوق کی تھیں بدگمانیاں اپنی

یہ زعم تھا کہ چھپا لیں گے حالِ دل اس سے
ملے تو روئے ، سنائیں کہانیاں اپنی

کہیں چراغ ، کہیں گل ، کہیں یہ زلف دوتا
تری گلی میں تھیں طرفہ نشانیاں اپنی

وہ روشنی ہو ، اماوس کی رات گھبرائے
ملا دو خاک میں ایسے جوانیاں اپنی

---

✺

سب شکلوں کی ایک ہی صورت، سب باتوں کا ایک ہی رنگ
دِن رنگوں کے چولے بدلے پر راتوں کا ایک ہی رنگ

ہر آہٹ، ہر سایہ آخر ذہن کا پاگل پَن نکلا
قریہ قریہ ویرانی ہے سب گھاتوں کا ایک ہی رنگ

خُون میں شُعلۂ غم کی حِدّت جسم میں چھُپ کر رہ نہ سکے
آنکھ سے ٹپکے لہُو کی صُورت، سوغاتوں کا ایک ہی رنگ

دو سائے جب آگے سرکیں، ایک ہی سایہ رہ جاتا ہے
سات رنگ سے دھنک بنے ہے پر ساتوں کا ایک ہی رنگ

میرے اندر کی تنہائی، میری ذات کا دُہرا پن
دیمک بن کر چاٹ رہا ہے، سب ذاتوں کا ایک ہی رنگ

دُھوپ چڑھی تو سونا چمکا، دُھوپ ڈھلی تو سرسوں تھی
ہر اِک جانب جَم گئی کائی، برساتوں کا ایک ہی رنگ

گھاس اُگی اس پگڈنڈی پر جس سے گُزر کے ہم ملتے تھے
کُنج اماں بھی سڑکیں بن گئیں، سب ماتوں کا ایک ہی رنگ

ہنستے چہروں کی آنکھوں میں خُون جما ہے یادوں کا
سب شکلیں ہیں حُجلۂ حسرت باراتوں کا ایک ہی رنگ

---

✺

حوصلہ، شرطِ وفا، کیا کرنا
بند مُٹھّی میں ہَوا ، کیا کرنا

جب نہ سُنتا ہو کوئی ، بولنا کیا
قبر میں شور بپا ، کیا کرنا

قہر ہے لُطف کی صُورت آباد
اپنی آنکھوں کو بھی وَا ، کیا کرنا

درد ٹھہرے گا وفا کی منزل
عکس شیشے سے جُدا ، کیا کرنا

شمعِ کُشتہ کی طرح جی لیجے
دم گُھٹے بھی تو گِلہ کیا کرنا

دِل کے زِنداں میں ہے آرام بُہت
وُسعتِ دشت نما کیا کرنا

میرے پیچھے مرا سایہ ہوگا
پیچھے مُڑ کر بھی بھلا کیا کرنا

کچھ کرو یُوں کہ زمانہ دیکھے
شور گلیوں میں سدا کیا کرنا

---

٭

کچھ نہ کہنے کا بھی چرچا ہی ہُوا
غمِ تعلّق کا تماشا ہی ہُوا

ہر طلب، ذِلتِ خود داری تھی
تم نہ تھے ساتھ، یہ اچھا ہی ہُوا

لوگ مل مل کے بچھڑ جاتے ہیں
ہمسفر ٹُوٹتا پتّا ہی ہُوا

جب نہ آنکھوں سے لہُو بھی ٹپکے
درد ٹھہرا ہُوا دریا ہی ہُوا

حُسنِ دُنیا ہے خیالوں کا صدف
رنگ بھی آنکھ کا پردا ہی ہُوا

ہر سِتم ہنس کے سہا ہے ناہید
دِل بھی پتّھر کا نمونہ ہی ہُوا

---

✺

ہر قدم پر سائے ہیں، رنگت بھرو
ہر طلب کشکول ہے، چاہت بھرو

کب تلک لپٹو گے دیواروں کے ساتھ
قعرِ دل میں اِک نئی وحشت بھرو

آنکھ رکھو رتجگوں سے آشنا
گود میں خُوں چاٹتی خلوت بھرو

مسخ ہیں چہرے، زباں خُوں آشنا
کاسۂ تعمیر میں حیرت بھرو

لاکھ ہو بیزاریٔ خود آگہی
اپنی بربادی میں بھی رنگت بھرو

بے سبب اچھی نہیں تشہیرِ غم
یُوں نہ آنکھوں میں شَۓ حسرت بھرو

میرے ہنّسنے پر نہ جاؤ دِل زدو!
میرا چہرہ دیکھ کر رنگت بھرو

---

کچھ بولِ گفتگو کا سلیقہ نہ بھول جائے
شیشے کے گھر میں تجھ کو بھی رہنا نہ بھول جائے

وا رکھ سدا دریچۂ خود آگہی کہ تُو
اچھے تو کیا بُروں کو پرکھنا نہ بھول جائے

زخمِ نہاں کو شوقِ طلب سے جُدا نہ کر
ہوتا ہے روز و شب جو تماشا نہ بھول جائے

کر دیں نہ بے طلب یہ مسلسل اذیتیں
دل بھی کہیں وفا کا سلیقہ نہ بھول جائے

منزل کا نشہ، قُربتِ منزل نہ چھین لے
اپنی گلی میں آکے ہی رستہ نہ بھُول جائے

مت رکھ تضادِ ظاہر و باطن کہ آدمی
تجھُ کو ترے عمل سے پرکھنا نہ بھُول جائے

وہ بھیڑ ہے کہ شہر میں چلنا محال ہے
اُنگلی پکڑنا باپ کی بچہ نہ بھُول جائے

ناہید، رفعتیں تو ملیں گی بہت مگر
آنکھوں کو اپنے شہر کا نقشہ نہ بھُول جائے

---

٭

یہ میری ذات تو مجھ میں سما کے رہ نہ سکے
وہ دشت ہُوں کہ سمندر چھپا کے رہ نہ سکے

وفورِ تشنہ لبی، خوں بھی سرد کر کے رہے
ہَوا ہے بند، کوئی گھر میں آ کے رہ نہ سکے

ہزار خواب کے پیوند، گفتگو کے طلسم
غموں کے زہر کو امرت بنا کے رہ نہ سکے

عذابِ نفس سے جُھلسا ہُوا ہے ہر پیکر
وہ آگ ہے کوئی دامن بچا کے رہ نہ سکے

زباں سِلی ہے تو آنکھوں سے گفتگو کر لے
جو غم کا زہر رگوں میں چُھپا کے رہ نہ سکے

❋

کبھی نظر تو آ، تسکینِ اضطراب تو دے
مری کھُلی ہُوئی آنکھوں کو کوئی خواب تو دے

جواز ڈھونڈ نہ برسوں کی رنجشوں کا مگر
قریب آکے تماشائے اجتناب تو دے

کبھی تو سنگِ صدا توڑ دے سکوتِ وفا
کبھی وہ خواب میں آکر دمِ سراب تو دے

مَیں زخمِ تشنہ لبی سے لپٹ کے رو لُوں گی
نہ دے سکونِ وفا، قہرِ اضطراب تو دے

نہ چھین ہم سے ہی، یک گونہ لذّتِ تدبیر
نسیمِ مسندِ گُل، عرصۂ حباب تو دے

بچھڑ کے ملنے میں لذّت سہی مگر نا امید
کبھی تو وصلِ مسلسل کا ہی عذاب تو دے

✺

آنکھ میں رات کے منظر ٹھہرے
راکھ میں جیسے گُلِ زر ٹھہرے

فتنہ ساماں دلِ کم کوش ہوگا
وہ ستمگر کبھی دَم بھر ٹھہرے

جاں کنی ، زادِ سفر گردانو
رہزنی ، شوخیٔ رہبر ٹھہرے

ہم طلب کس کی کریں کیسے کریں
کنکری قیمتِ جوہر ٹھہرے

دستکوں پر نگراں ہو ہر سانس
سلوٹوں سے مرا بستر ٹھہرے

ہر قدم پر نئی تعزیریں ہیں
کوئی بھی گھر سے نہ باہر ٹھہرے

مَیں کہ ہوں شوخ طبیعت ناہیدؔ
کتنے طوفاں مرے اندر ٹھہرے

---

٭

اُترا غبارِ درد و الم مُدّتوں کے بعد
آئی ہے موجِ بادِ کرم مُدّتوں کے بعد

پھر دل کو ہو گئی ہے وہی رہگزر عزیز
پھر آ گئے فریب میں ہم مُدّتوں کے بعد

پھیلی ہے سطحِ ذہن پہ ہلکی سی چاندنی
پلٹے ہیں تیری یاد سے ہم مُدّتوں کے بعد

دِل میں رکھیں کہ سر سے لگائیں کہ چُوم لیں
دیکھا ہے ایک نقشِ قدم مُدّتوں کے بعد

ہم تو وفا شعار رہے ہیں تمام عُمر
تم نے جفا بھی کی تو صنم مدّتوں کے بعد

ناہید خونِ دل میں قلم کو ڈبو کے آج
لکھّی ہے داستانِ الم مُدّتوں کے بعد

تِشنگی اچھی نہیں رکھنا بہُت
روزنِ گُل سے اُسے تکنا بہُت

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہُت
سر کو اُس کے سامنے ڈھکنا بہُت

خوب ہے آرائشِ غم کا سفر
خوش نہیں پر تلخیاں رکھنا بہُت

جِس کی آنکھوں میں نہ جھانکا جائے گا
اس کی ہی تحریر کو پڑھنا بہُت

عمر بھر کی بندشیں خواب و خیال
دو قدم بھی ساتھ ہے چلنا بہت

موجۂ ریگِ رواں ہے زیرِ آب
اپنی ہستی دیکھ کر بڑھنا بہت

زرد رُو تنہائیوں کے شہر میں
بُجھتے دیپوں کی طرح جلنا بہت

گھر کے اندر کاٹتی ہے تیرگی
گھر سے باہر رہ کے بھی ڈرنا بہت

برف کی مانند جینا عُمر بھر
ریت کی صورت مگر تپنا بہت

خستگی ناہید بن جائے نہ جُرم
کُچھ نہ ہو لیکن بھرم رکھنا بہت

---

✲

خیالِ طوقِ تعلق کو ٹالتے رہیے
ہَوا میں کوئی [illegible] اُچھالتے رہیے

پُرانے آشنا چہروں کو یاد کرکر کے
ہجومِ غم میں بھی دل کو سنبھالتے رہیے

تمام عُمر یونہی کیجے حسرتوں کا شمار
تمام عُمر یونہی دُکھ سنبھالتے رہیے

سجا کے روز نئی محفلیں، نئے چہرے
زرِ فسردہ دِلی کو اُچھالتے رہیے

رہیں نہ دشت جو صحرا نوردیوں کے لیے
تو اپنے صحن میں پتّھر اُچھالتے رہیے

نہ مل سکیں جو وہ یارانِ گُل صفت ناہیدؔ
تو اپنے آپ کو سانچوں میں ڈھالتے رہیے

خوشبو کو رنگتوں پہ اُبھرتا ہُوا بھی دیکھ
نقشِ زرِ بہار چمکتا ہُوا بھی دیکھ

رکھ کے مدارِ شوق کسی آفتاب پر
تُو، سنگِ انتظار پگھلتا ہُوا بھی دیکھ

آنکھوں کے گرد جھانکتے حلقے نہ دیکھ تو
سَیلِ خجستہ خُو کو اُترتا ہُوا بھی دیکھ

بے فیض دشتِ درد میں آہستگی کے ساتھ
آہُو سرشت لوگوں کو چلتا ہُوا بھی دیکھ

رنگِ حِنا کو نقشِ قدم سے جُدا بھی کر
صحرا میں رخشِ شوق کو گرتا ہُوا بھی دیکھ

محسوس کر چھلکتے ہوئے شوق کی جلن
یخ چاندنی میں جسم کو جلتا ہُوا بھی دیکھ

ہر چیز دے کے جاتی ہے اپنی نشانیاں
ہر گُل میں رنگِ صُبح جھلکتا ہُوا بھی دیکھ

ناہید چہرہ دستیٔ یاراں عزیز رکھ
موقع کے ساتھ اُن کو بدلتا ہُوا بھی دیکھ

---

بیٹھی ہوں راہ میں کسی تصویر کی طرح
وہ بھی کبھی تو آئے گا رہگیر کی طرح

چلتے ہیں بے سبب کہ کوئی روکتا نہیں
تخریبِ خواہشات ہے تعمیر کی طرح

آنکھوں میں ہے سوادِ تمنّا کی داستاں
ریگِ رواں ہے موجۂ تنویر کی طرح

گر تُو نہیں تو تیری شباہت کہیں تو ہو
پڑھتی ہوں ہر نظر تری تحریر کی طرح

ملتی نہیں ہے قیدِ وفا سے رہائی بھی
اٹکی ہے سانس سینے میں زنجیر کی طرح

بھرتے ہیں جو شریکِ سفر ہمرہی کا دم
چلتے ہیں ساتھ ساتھ عناں گیر کی طرح

ناہید اپنے اپنے سلیقے کی بات ہے
کرتے ہیں وہ کرم بھی تو تعزیر کی طرح

---

✺

سُلگ رہی ہے ان آنکھوں میں دیکھنے کی لگن
ترے فراق کی شدّت سے پھُنک رہا ہے بدن

یہ شورِ بند و سلاسل، یہ ذکرِ دار و رسن
بدل سکے نہ کبھی خُوگرِ وفا کا چلن

یہ چارہ ساز، یہ واعظ، یہ ناصحِ مشفق
مِلا نہ ان کی خُدائی میں اہلِ دِل کو کفن

تمھارے درد کے مارے تمھیں سے کیا کہتے
کہ ٹوٹتا ہے جُدائی میں کس طرح سے بدن

جہاں بھی عشق نے ڈالی ہے آرزو کی کمند
وہیں پڑی ہے جبینِ ہوس پہ اور شکن

نئے مگر، دلِ خوش فہم کے طریقے ہیں
ہنسا ہے جب بھی ہُوا ہے وفورِ رنج و محن

نظر میں آج بھی پھیلا ہُوا ہے دُور تلک
وہ بہتا نیلا سمندر وہ ہنستا نیل گگن

کبھی تو جھانکیے اُس خواہشوں کے پیکر میں
ہجومِ رنگ سے جنگل بنا ہُوا ہے چمن

حیا سے سُرخ ہُوا رنگ، تو کھلے گُل بھی
دکھا گئی تری صُورت حجاب کی چلمن

سُنی ہے ایک زمانے کے بعد سرگوشی
مہک اٹھی ہے تمنّا، چمک اٹھی دھڑکن

کھلونا ٹوٹتے دیکھوں تو آنکھ بھر آئے
ابھی تلک نہیں بھولی ہے زندگی بچپن

---

شمیمِ صبح سے میرے بدن کی آنچ نہ پوچھ
صباحتِ چمن اندر چمن کی آنچ نہ پوچھ

تمام عمر رہے خشت کوبیِ جاں میں
تمام عمر سفالِ دہن کی آنچ نہ پوچھ

شفق کے رنگ میں ڈوبے ہیں دشت و صحرا ابھی
چمن میں شعلہ رُخانِ چمن کی آنچ نہ پوچھ

ابھی تلک مرے کانوں پہ آگ رقصاں ہے
ابھی تلک ہے اسی انجمن کی آنچ نہ پوچھ

اندھیری رات عزیزوں کے غم سے روشن ہے
غریبِ شہر سے سوزِ وطن کی آنچ نہ پوچھ

کریدتا ہے تعلّق کی گرم بھوبھل کو
بدن سے چمٹے ہُوئے پیرہن کی آنچ نہ پُوچھ

ہر ایک آنکھ بُلاوا ہے اُڑتے لمحوں کا
عروسِ حجلۂ غم، انجمن کی آنچ نہ پُوچھ

ضبط اتنا بھی نہ کر، احساس مُرجھا جائے گا
سُرخ گالوں کا چمکتا رنگ زردا جائے گا

مَیں کبھی جذبہ، کبھی وعدہ، کبھی خمیازہ ہُوں
تُو مرے وجہِ تعلّق سے نکھرتا جائے گا

رُوح بھی تشنہ رہے گی ریگِ ساحل کی طرح
جسم بھی شوقِ تعلّق میں اُجڑتا جائے گا

تشنۂ گریہ ہُوں مُدّت سے، تماشا ہُوں ترا
تُو کہاں تک اپنے سائے سے اُلجھتا جائے گا

اے سحی

اَن گنت لوگوں کی چاہت نے اسے دُھندلا دیا
وہ کہاں تک اپنی صُورت کو بدلتا جائے گا

برف آنکھوں پر کوئی حِدّت اثر کرتی نہیں
ہاں مگر ہر فردِ غم سے دل پگھلتا جائے گا

شامِ غم جس سے ملو، پہروں وہ یاد آئے گا پھر
ہاں مگر کچھ دن میں وہ چہرہ بھی دُھندلا جائے گا

ڈھیر ہو جائے گا سُورج ایک دن جل جل کے آپ
چاند پتّوں کی طرح آخر کو مُرجھا جائے گا

مَیں، تری خُوئے تلوّن کے کھُلے صحرا میں ہوں
مجُھ سے ہی کب تیرے گھر کا رستہ ڈھونڈا جائے گا

زعم ہے اس سے بچھڑ کر، بھُول جائیں گے اسے
کب مگر اپنی طبیعت ہی کو بدلا جائے گا

رنگ دکھلائے گا کچھ، آخر شکستوں کا شمار
ہونٹ سی لو گی تو آنکھوں میں ابھرتا جائے گا

اندمالِ غم بھی ہے ناہید طرحِ تازہ غم
تشنگی جتنی بڑھے، شعلہ بھڑکتا جائے گا

---

میں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں

میں ترا رنگ ہر اِک مطلع در سے مانگوں
میں ترا سایہ ہر اِک رہگزر سے چاہوں

صحبتیں خوب ہیں خوش وقتیٔ غم کی خاطر
کوئی ایسا ہو جسے جان و جگر سے چاہوں

میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
میں اُسے چاہوں تو خود اپنی خبر سے چاہوں

آنکھ جب تک ہے نظارے کی طلب ہے باقی،
تیری خوشبو کو میں کس ذوقِ نظر سے چاہوں

گھر کے دھندے کہ نمٹتے ہی نہیں ہیں ناہید
میں نکلنا بھی اگر شام کو گھر سے چاہوں

---

کبھی تو آ مری آنکھوں کی روشنی بن کر
زمینِ خشک کو سیراب کر نمی بن کر

رچا ہُوا ہے تری کم نگاہیوں کا کرم
نشے کی طرح مرے دل میں سرخوشی بن کر

کبھی تو آ تپشِ جانگسل ہی دینے کو
کبھی گزر انہی راہوں سے اجنبی بن کر

خوشا کہ اور مِلا غم کا تازیانہ ہمیں
خوشا وہ درد جو چھایا ہے نغمگی بن کر

تمہیں عزیز نہیں ہے تو ہو عزیز کسے
نہ مل سکے گا کوئی وجہِ زندگی بن کر

پلٹ کے دیکھ نہ اس کو وہ خاک کر دے گا
ترے غرور کو زہراب کی اَنی بن کر

ہُوئی نہ ان سے وفا تم سے کیا ہُوا ناہید
ابھی تلک رہے جاتی ہو باولی بن کر

---

دب نہ رہیں آلام تلے ، صبر کرو
آگ بُجھاتے دیر لگے ، صبر کرو

بن دیکھے بھی سامنے اس کی صُورت ہے
بن بولے بھی بات بڑھے ، صبر کرو

زُلفِ تمنّا کھنچتی گئی ، پُر پیچ ہُوئی
شانۂ تسکیں خواب رہے ، صبر کرو

کب پھر بولیں پتّھر بھی اس وادی کے
کب پھر رات کا ایک بجے ، صبر کرو

پھر رکھے گا ہاتھ تمہاری آنکھوں پہ
پھر آئے گا پاؤں دبے ، صبر کرو

تھمتے تھمتے اشک تھمیں، دل ٹھہرے
ڈوبتی ناؤ پار لگے ، صبر کرو

پچھلی رات وہ آئے گا مغموم نہ ہو
پو نہ پھٹے گی ایسے سمے، صبر کرو

جی بھر کر کب دیکھ سکو گے تم اس کو
آجاؤ گے پاؤں تلے ، صبر کرو

تم بھی آخر چین کی نیندیں سوؤ گے
تم پر دن آئیں گے بھلے ، صبر کرو

یوں ہی رہو ناہید الجھتی کانٹوں سے
وقت کی ندی یوں ہی بہے، صبر کرو

---

ہر مرحلہ پہ شوق تماشائی چاہیے ہے
عشقِ نمود پیشہ بھی رسوائی چاہیے ہے

گھُلنے لگا ہواؤں میں مایوسیوں کا زہر
پھر جی اُداس ہے وُہی پُروائی چاہیے ہے

ڈھونڈے ہے اپنی ضِد کے مقابل کی کوئی شے
شوقِ جنُوں شعار تو رسوائی چاہیے ہے

خوبی ہے لاکھ وصفِ تحمّل، شکیب وضبط
لیکن نگارِ شوق پذیرائی چاہیے ہے

یہ دل نہ چل سکا کبھی اُڑتی ہَوا کے ساتھ
یہ دل تعلقات کی گہرائی چاہے ہے

جلوہ نہ ہو تو موجِ جنوں تیز کیسے ہو
آنکھیں نہ ہوں تو کون تماشائی چاہے ہے

وہ کون ہے جو ساتھ ہمارے بھی چل سکے
وہ کون ہے جو غم سے شناسائی چاہے ہے

رکھو تو زندگی میں شریکِ الم کوئی
ناہید، عرضِ حال بھی شنوائی چاہے ہے

اپنی ہی بات نبھانی سیکھو
پھر مجھی شمع جلانی سیکھو

مل کے آنکھیں اُسے دیکھو پھر سے
بہتے دریا سے روانی سیکھو

اُس کو چاہو تو اُسی کو چاہو
پیار کی ریت نبھانی سیکھو

خواہشِ دید فروزاں رکھو
صُبح تک شمع جلانی سیکھو

رمزِ خود سوختنی، بے طلبی
ہر گُلِ تر کی زبانی سیکھو

یہ بھی کیا ایک خیال، ایک ہی خواب
تم بھی تو نقلِ مکانی سیکھو

اُس کی باتیں ہی سہی، وہ نہ سہی
دولتِ درد بڑھانی سیکھو

اُس کی یادوں کے اُجالے لے کر
غم کی محراب سجانی سیکھو

عمر بھر ساتھ چلے گا نہ کوئی
وقت کے ساتھ نبھانی سیکھو

ہر تمنّا کو بدل کر دیکھو
کچھ محبّت میں گرانی سیکھو

منتشر دِل کے حوالے کب تھے
ہم تجھے بھولنے والے کب تھے

ہر طلب تازہ جراحت تھی مگر
خارِ غم دل سے نکالے کب تھے

ہم کہ محرومِ لبِ گویا تھے
داغِ دِل ہم نے اُچھالے کب تھے

اب تو حدّت سے ہیں آنکھیں گُلرنگ
یُوں چھلکتے ہُوئے پیالے کب تھے

رچ گئیں یادیں سویرے بن کر
تجھ سے پہلے یہ اُجالے کب تھے

بچھڑے جاتے ہیں رفیقوں کی طرح
میرے ہمدم مرے چھالے کب تھے

مُن برستا ہے تری یادوں کا
خانہ ویراں یہ شوالے کب تھے

وضعِ غم، جبرِ مسلسل، یعنی
جانکنی کے بھی ازالے کب تھے

ساتھ تھے بس کہ ہمیں چلنا تھا
آشنا قافلے والے کب تھے

ہم تو تھے کھوکھلے خود ہی ناہید
دل کی دیوار سنبھالے کب تھے

٭

وہ اجنبی تھا، غیر تھا، کس نے کہا نہ تھا
دِل کو مگر یقین کِسی پر ہُوا نہ تھا

ہم کو تو احتیاطِ غمِ دِل عزیز تھی
کچھ اس لیے بھی کم نگہی کا گِلہ نہ تھا

دستِ خیالِ یار سے پھُوٹے شفق کے رنگ
نقشِ قدم بھی رنگِ حنا کے سوا نہ تھا

ڈھونڈا اُسے بہت کہ بُلایا تھا جس نے پاس
جلوہ مگر کہیں بھی صدا کے سوا نہ تھا

کچھ اس قدر تھی گرمیٔ بازارِ آرزو
دِل جو خریدتا تھا اسے دیکھتا نہ تھا

کیسے کریں گے ذکرِ حبیبِ جفا پسند
جب نام دوستوں میں بھی لینا روا نہ تھا

کچھ یُوں ہی زرد زرد سی ناہید آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کُھلتا ہُوا نہ تھا

انھیں یہ ضد کہ ملاقات کا فسوں نہ رہے
وہ اِنتظار رہے آنکھ میں بھی خوں نہ رہے

سیہ رات کے سینے سے لگ کے بیٹھے رہو
تمہیں بھی حسرتِ دریوزۂ جنوں نہ رہے

پھر ایک بار جمالِ نگارِ شب نکھرے
وہ برہمی ہو کہ پھر حسرتِ سکوں نہ رہے

چلو کہ سلسلۂ روز و شب مٹا ڈالیں
اُداسیوں کا سبب چرخِ نیلگوں نہ رہے

دُرست ہے کہ زمیں آسمان مِلتے ہیں
زمیں کی خاک تری بندگی میں کیوں نہ رہے

کبھی تو سچ ہو مرے خوابِ دید کی تعبیر
کبھی تو کاسۂ تسکین، واژگوں نہ رہے

یہ جانکنی کا کہن طوق توڑ دے کوئی
خوشا کہ سلسلۂ زندگی بھی یوں نہ رہے

مَیں شاعرہ نہ رہوں مُشتِ خاک رہ جاؤں
مرا حریف اگر جذبِ اندروں نہ رہے

ایک ہی آواز پہ واپس پلٹ آئیں گے لوگ
تجھ کو پھر اپنے گھروں میں ڈھونڈنے جائیں گے لوگ

ڈوبتے سورج کی صورت میرا چہرہ دیکھ لو
پھر کہاں بابِ معانی ڈھونڈنے جائیں گے لوگ

مت کہو قسمت ہے اپنی بے دِلی، ناگفتنی
پھر سحر ہوگی درخشاں پھر بھلے آئیں گے لوگ

پل جھپکنے تک ہے یہ ہنگامۂ وارفتگی
جب نظر سے دُور ہو گے بھولتے جائیں گے لوگ

پھر نئی خواہش کے ذرّوں سے بنائیں گے نگر
پھر نئی رسمِ طلب، رسمِ وفا لائیں گے لوگ

منحصر رنگوں کی آتش پر نہیں ہے دِلکشی
میلے کپڑوں میں بھی تجھ کو دیکھنے آئیں گے لوگ

---

٭

گریہ، مایوسی، غمِ ترکِ وفا کچھ نہ رہا
زندگی رہ گئی جینے کا مزا کچھ نہ رہا

روشنی تھی تو ہر اِک شے کی حقیقت تھی عیاں
تیرگی میں مری آنکھوں کے سوا کچھ نہ رہا

پیرہن رنگ برنگے نکل آئے اتنے
نو دمیدہ گُلِ شبو میں چھپا کچھ نہ رہا

کھا گئی خاک ہی کو خاک کریں کس سے گلہ
کیا کُریدیں کہ تہہِ خاک چھپا کچھ نہ رہا

تیرے مِلنے کے نئے ڈھنگ بھی تسلیم مگر
ذائقہ اس طرح بدلا کہ مزا کچھ نہ رہا

کیوں نہ ہو حشر بپا دادِ وفا کیوں نہ مِلے
جب ترے چاہنے والوں کے سوا کچھ نہ رہا

خوشبوئے وصل، توجّہ کا وہ عالم، وہ خلوص
ڈوبتے چاند کی آغوش میں کیا کچھ نہ رہا

٭

ترے قریب پہنچنے کے ڈھنگ آتے تھے
یہ خود فریب مگر راہ بھول جاتے تھے

ہمیں عزیز ہیں اُن بستیوں کی دیواریں
کہ جن کے سائے بھی دیوار بنتے جاتے تھے

ستیزِ نقشِ وفا تھا تعلّقِ یاراں
وہ زخمۂ رگِ جاں چھیڑ چھیڑ جاتے تھے

وہ اور کون ترے قُرب کو ترستا تھا
فریب خوردہ ہی تیرا فریب کھاتے تھے

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے تھے

اب ایک عمر سے دُکھ بھی کوئی نہیں دیتا
وہ لوگ کیا تھے جو آٹھوں پہر رُلاتے تھے

وہ لوگ کیا ہوئے جو اونگھتی ہوئی شب میں
درِ فراق کی زنجیر سی ہلاتے تھے

---

جب میَں نہ ہُوں تو شہر میں مُجھ سا کوئی تو ہو
دیوارِ زندگی میں دریچہ کوئی تو ہو

اِک پل کسی درخت کے سائے میں سانس لے
سارے نگر میں جاننے والا کوئی تو ہو

اے خوئے اجتناب تعلّق کہیں تو رکھ
بے چارگی میں پُوچھنے والا کوئی تو ہو

دیکھے عجیب رنگ میں تنہا ہر ایک ذات
ان گہرے پانیوں میں اُترتا کوئی تو ہو

ڈھونڈوگے جس کو دل سے وہ مل جائے گا ضرور
آئیں گے لوگ آپ، تماشا کوئی تو ہو

پھر کوئی شکل بام پہ آئے نظر کہیں
پھر رہگزارِ عام میں رُسوا کوئی تو ہو

کوئی تو آرزوئے فروزاں سنبھال رکھ
ہاں اپنے سر پہ قرضِ تمنّا کوئی تو ہو

ہر دم علاجِ مہر و وفا ڈھونڈتے رہو
اس تیرگی میں گھر کا اُجالا کوئی تو ہو

ناہید بندشوں میں مقید ہے زندگی
جائیں ہزار بار، بُلاوا کوئی تو ہو

✻

اب تم بھی چھپاؤ نہ یہ داغ اور زیادہ
لگتا ہے حقیقت کا سراغ اور زیادہ

جھٹلاتے ہیں جتنا بھی گرانباریٔ دِل کو
ملتا ہے نگاہوں سے سراغ اور زیادہ

مِٹ جاتے اسی قتل گہِ دل میں بھی ہم لوگ
بھرتے جو ترے غم کے ایاغ اور زیادہ

یہ کاسۂ دریوزۂ غم بھر نہیں پاتا
مٹ جائے زمانے سے فراغ اور زیادہ

جب دِل میں شام ہی پڑتی ہے گرہ سی
جلتے ہیں نگاہوں میں چراغ اور زیادہ

ناہیدؔ کوئی آ کے ستائے بھی تو ہم کو
مہکائیں گے زخموں کے یہ باغ اور زیادہ

---

✺

جس کی تصویر ہے آنکھوں میں حیا کی مانند
پاس آتا ہے مرے موجِ صبا کی مانند

سایہ بن جاتی ہے ہر یاد صدا دینے پر
سنسناتا ہے یہ دل شہرِ وفا کی مانند

کس طرح کہہ دوں کہ دیکھا ہی نہیں ہے اسکو
پاس ہے میرے وہ نا دیدہ خدا کی مانند

ایسی گردش ہے کہ اب خواب ہوئے خوابِ طرب
نیند آتی ہے تو جینے کی سزا کی مانند

تیرے غم سے بھی دُھلے گی نہ سیاہی دِل کی
رنگ دکھلائے گا کچھ اور حنا کی مانند

یاس کی سِل ہے کہ سینے پہ دھری ہے ہردم
درد کی کہُر ہے پلکوں پہ ردا کی مانند

---

جس نے بھی حالِ غمِ دِل پُوچھا
ہم نے اُس کو ہی مسیحا سمجھا

بھُول بچپن کی ہمیں یاد آئی
چاند جب قوس کی صُورت دیکھا

جیسے جاذب پہ سیاہی پھیلے
یُوں تری یاد کا دریا اُمڈا

شہر میں یُوں تو نہ رُسوا ہوتے
نام جو اُس کا نہ پُوچھا ہوتا

کوئی بھُولا ہُوا گھر آئے گا
آج اِک بُلبُلہ آٹے میں اُٹھا

دِل بھی تصویر کی صُورت ناہید
عمر بھر یُوں ہی رہے گا تنہا

تمہاری یاد میں ہم جشنِ غم منائیں بھی
کسی طرح سے مگر تم کو یاد آئیں بھی

چھلک ہی پڑتے ہیں خود ہی گلاب آنکھوں کے
وہ پاس آئیں تو یہ داستاں سُنائیں بھی

ہر ایک لمحہ یہی بے کلی سی ہے دل میں
کہ اُن کو یاد کریں، اُن کو بھُول جائیں بھی

جوان گیہوں کے کھیتوں کو دیکھ کر رو دیں
وہ لڑکیاں کہ جنھیں بھُول بیٹھیں مائیں بھی

تمام عمر یونہی رتجگوں سے کیا حاصل
اُنہیں بھُلائیں ذرا نیند کو بُلائیں بھی

سکون ملتا ہے جلتی ہوئی دوپہروں میں
بنی ہیں مرہمِ دل دھوپ کی شعاعیں بھی

روا روی میں ہے ہر ایک صحبتِ یاراں
ملیں سکوں سے تو قصّے ترے سُنائیں بھی

وہ جن کے ذکر سے ناہیدؔ زندگی ہے حسیں
وہ لوگ آئیں تو آنکھوں پہ ہم بٹھائیں بھی

بگڑی بات بنانا مشکل ، بگڑی بات بنائے کون
کُنج تمنّا ویرانہ ہے ، آ کر پھول کِھلائے کون

تَن کی دولت، مَن کی دولت، سب خوابوں کی باتیں ہیں
نو من تیل نہ ہو تو گھر میں رادھا کو نچوائے کون

اپنا غم اب خود ہی اُٹھا لے ورنہ رُسوائی ہو گی
تیرا بھید چھپا کر دل میں ناحق بوجھ اُٹھائے کون

چلتی گاڑی، نام کا رشتہ، کیا موہن کیا رادھا آج
بَن کے سنوّر کے، راس رچا کے، موہن آج مَنائے کون

ساگر پار کی خبریں دیکھے ہمسائے کا پتا نہیں
آج کا انساں عالم فاضل اس کو اب سمجھائے کون

ناامیدی نامِ تمنا، اپنا مقدر، ہجرِ مسلسل
درد کے خارستان میں آکے دامن دل الجھائے کون

رات بھی کالی چادر اوڑھے آپہنچی ہے زینے میں
مہندی لگائے بیٹھی سوچے لٹ الجھی سلجھائے کون

---

٭

آنکھ میں چبھتی ہے جب ٹھہری ہو بِن برسے گھٹا
مختلف لگتی نہیں صحرا کے منظر سے گھٹا

کھینچ رکھا ہے حصارِ نامرادی ہر طرف
لگ کے بیٹھی ہے مری دیوار سے در سے گھٹا

راکھ کر ڈالا شبستانِ اُمید و آرزو
آگ ہیں اندر سے آنسو اور باہر سے گھٹا

جانے کب ہوں گے حنائی آس کی دیوی کے ہاتھ
جانے کب گزرے گی کشتِ دل کے اُوپر سے گھٹا

اور بھی بھڑکا گئی ناہیدِ غم کی آگ کو
جب کبھی اٹھی ترے غم کے سمندر سے گھٹا

---

✻

لگ گیا غم کی دیوار میں آئینہ
اب نہیں کوئی موجود تیرے سوا

شہر کے سارے دروازے کیوں بند ہیں
خونِ موجِ صبا دے رہا ہے صدا

ہونٹ بھی سِل گئے آنکھ بھی جھک گئی
آپ کو جاننا کچھ بھلا نہ ہُوا

ڈھونڈنے اس کو کس دیس میں جاؤ گے
اپنے ہی مُلک میں فاصلہ ہے بڑا

تشنگی، جانکنی ، برہمی کچھ نہیں
یعنی یہ کہ سمندر رہے ٹھہرا ہُوا

اک سمندر تھا یادوں کا پیشِ نظر
جب سفینہ کنارے چلا

تُو نہیں ہے تو کِس سے کریں بات ہم
جب تجھی سے کبھی حوصلہ نہ ہُوا

ٹیلی فونوں پہ رسمِ تعارف ہُوئی
نامۂ دوستی فائلوں میں کھُلا

گو ہیں مشہور چہرہ شناسی میں ہم
آپ کو دیکھ کر کھا گئے ہیں خطا

ٹھہر جاتے وہ اِمشب اِسی دیس میں
کوئی تو روکتا چاند کا راستہ

حسرت ہے تجھے سامنے بیٹھے کبھی دیکھوں
مَیں تجھ سے مخاطب ہوں ترا حال بھی پُوچھوں

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھُپا کر کہاں رکھوں

جس نام سے تُو نے مجھے بچپن میں پکارا
اِک عُمر گزرنے پہ بھی وہ نام نہ بھُولوں

تُو اشک ہی بن کے مری آنکھوں میں سما جا
مَیں آئینہ دیکھوں تو ترا عکس بھی دیکھوں

پُوچھوں کبھی غنچوں سے، ستاروں سے، ہَوا سے
تجُھ سے ہی مگر آ کے ترا نام نہ پُوچھوں

جو شخص کہ ہے خواب میں آنے سے بھی خائف
آئینۂ دِل میں اسے موجود ہی دیکھوں

اے میری تمنّا کے ستارے تُو کہاں ہے
تُو آئے تو یہ جسم شبِ غم کو نہ سونپوں

❋

وُہ اجنبی تھا پھر بھی لگا آشنا مجھے
کس سمت لے چلا ہے نیا حادثہ مجھے

واماندگیٔ شوق خلش بن کے رہ گئی
کیوں راستے میں چھوڑ گیا راہنما مجھے

مُجھ کو بھی ڈھونڈتی رمِ ایّام کی چمک
رکھتا عزیز گر کبھی میرا خُدا مجھے

مُجھ خستہ تن کو گھر میں کہاں ڈھونڈتے ہو اب
دو، وحشتِ نامرادیٔ دل میں صدا مجھے

واقف نہیں ہوں شکل سے، اطوار سے مگر
لگتا ہے اس کا نام ہی اکثر بھلا مجھے

مَیں گھر کی روشنی ہُوں مجھے محفلوں سے کیا
چہروں کے میکدے میں نہ تو دے صدا مجھے

اے کاش تُو بھی سُنتا کبھی آہٹوں کی گونج
تُو بھی مری طرح سے کبھی ڈھونڈتا مجھے

پیروں کے آبلے نہ مرا ساتھ دے سکے
جب رہنما بھی راہ کا پتھّر لگا مجھے

ناہید اُس کی یاد کا آنچل بھی آج تو
اُڑتا ہُوا، ہَوا میں بگولہ لگا مجھے

---

✺

دوستی زود رنج نکلی ہے
آگ تنکوں میں جلد پھیلی ہے

لب پہ ہیں مسکراہٹیں لیکن
دل کی چادر ہنوز میلی ہے

ہے سرِ شام، ماہتاب اُداس
کوئی لڑکی کہیں اکیلی ہے

ایک تیری رضا کی چاہت میں
دل نے ہر واردات سہہ لی ہے

دل کو دی ہیں تسلّیاں ہم نے
عمر بھر غم سے دوستی کی ہے

حوصلوں کی حکایتیں مت پوچھ
شوق کی ہر کمند ٹوٹی ہے

درد کی لو بھی مدھم ہو گئی
محفلِ حسرت برہم ہو گئی

دیکھ کے گھر کی ویرانی کو
چشمِ ستم گر پُر نم ہو گئی

غم کی فصیلیں اونچی ہو گئیں
خواہشِ دل بھی محکم ہو گئی

جاگ اُٹھے خوابوں کے جزیرے
اُن کی توجہ جس دم ہو گئی

جب جب یاد نے ڈیرے ڈالے
دِل کی خلِش کم کم ہو گئی

گیلی سُلگتی لکڑی عورت
سیلِ زماں میں مدغم ہو گئی

خیر ہو یا رب دشت و دمن کی
آنکھ جنُوں کی پُر نم ہو گئی

ہم سے ہی ناہید جہاں میں
بھُول وفا کی پیہم ہو گئی

٭

ہم سفر راستے ، راہبر راستے
آج تو بن گئے چارہ گر راستے

دیکھ کر چُپ رہے کُشتۂ شوق کو
جان کر بن گئے بے خبر راستے

پھر جلے گی نگاہوں میں شمعِ الم
پھر دکھاتے ہیں سُونے نگر راستے

ناشناسائے قلب و جگر تھے مگر
بن گئے محرمِ چشمِ تر راستے

اُڑ گئی چاندنی بھی مہک کی طرح
ایسے ویراں تھے وقتِ سفر راستے

ہر قدم پر نئی یاد ڈستی رہی
دِل دُکھاتے رہے عمر بھر راستے

اپنی ویران تنہائیوں کے تئیں
بن گئے حسرتوں کے نگر راستے

ہَوا چلے تو ہر اک زخم پھُول بن کے کھِلے
مری وفا کو شکستوں کا یہ چمن ہی مِلے

نہ ہم سے بات کرے بے مُدّعا، زمانہ شناس
نہ ہم سے پُوچھ کہ ہم کس لیے جہاں میں جیے

دِلوں میں چیختی پھرتی ہے، خامشی تنہا
نظر میں بھیگتی شب کے ہیں آنسوؤں کے دیے

اسے بھُلاؤ گے کیسے، کدھر کو جاؤ گے
تمھارے دل میں ہیں اس کے ہزار رُوپ چھُپے

اُداس کر گیا ٹھنڈی ہَوا کا اِک جھونکا
تمہارے قرب کی چاہت کے بام و دَر مہکے

وہ شخص رنگ ہے، نکہت ہے، روشنی ہے مری
وہ جس کے بعد زمانے میں کچُھ بھلا نہ لگے

مَیں راکھ اپنی ہی شمعِ وفا کی ہُوں ناہیؔد
مری طرح کوئی خوشیوں کی آگ میں نہ جلے

---

٭

ہونٹوں پہ ہے سوادِ تمنّا کی داستاں
آنکھوں میں رتجگوں کی جلن ہے بُجھی ہوئی

پھنکارتا ہے شہر میں تنہائیوں کا سانپ
لہرا سکے نہ چاہ کے بادل یہاں کبھی

تیرے تصوّرات میں ڈوبے جو ایک بار
رنگوں کی نہر موجِ خیالات سے بھری

جب شہر سے چلے تو زمانے کو غم ہُوا
تھے شہر میں تو مُنہ نہ لگاتا تھا کوئی بھی

دیکھا ہے جب سے رنگِ زمانہ قریب سے
ہیں آہُوئے خیال کی آنکھیں پھٹی پھٹی

پُوچھو جو ایک بار سُنائیں ہزار بار
ناہید ذکرِ دوست ہے تفسیرِ زندگی

آس کی دُودھیا چاندنی مِل گئی
تم مِلے مدھ بھری راگنی مِل گئی

ایک پَل کے لیے ہنس پڑے تھے مگر
عمر بھر کے لیے جانکنی مِل گئی

یاد آئی تو اُجڑی ہوئی راہ میں
پھُول، صہبا، صبا، چاندنی مِل گئی

جب روانہ ہُوا یاد کا قافلہ
دردِ اُلفت کی چھاؤں گھنی مِل گئی

اَب کے ناہیدؔ خوش ہے کہ برسات میں
اوڑھنی چمپئی جامنی رل گئی

❋

اہلِ دل، آؤ سُنو تو ہم بھی افسانہ کہیں
کچھ دہانِ زخم کھولیں، جورِ جانانہ کہیں

پھر پلٹ آئیں لُٹا کر ہم متاعِ زندگی
پھر نظر کو دشت و صحرا دل کو ویرانہ کہیں

ہم تو چڑھ کے دار پر بھی عشق کے گائیں گے گیت
لوگ ہم کو شوق سے چاہیں تو دیوانہ کہیں

ہم وفا پیشہ، وفا خوگر، وفا کے مُدّعی
زندگی کو تیری بے مہری کا نذرانہ کہیں

ہنس کے پی لیں خونِ دِل اور ہنس کے ہی ناہیدہم
آنسوؤں کو مے کہیں، آنکھوں کو پیمانہ کہیں

٭

شاعروں کے جو پاس رہتے ہیں
دُکھی اکثر اُداس رہتے ہیں

غم بہر طور اور بہر عالم
زندگی کا لباس رہتے ہیں

داغ دِل کے کبھی محبّت میں
بن کے سینے میں آس رہتے ہیں

دِل کی دھڑکن بھی اب نہیں میری
آپ کیوں اتنے پاس رہتے ہیں

دل بہت ڈھونڈتا ہے تنہائی
ہم بہت اُن کے پاس رہتے ہیں

٭

اشکوں کو مزے سے پی لو جی، غم اور خوشی سے کھاؤ جی
گر تیشۂ عشق سلامت ہے، کچھ اور لگیں گے گھاؤ جی

ہم پھر سے محبّت کر لیں گے تم سامنے پھر سے آؤ جی
ہم جان کے دھوکا کھا لیں گے تم دامِ وفا پھیلاؤ جی

اے چارہ گرو یہ چارہ گری اک ڈھونگ ہے دل بہلاوے کا
حالات کو اور اُلجھانے کو، کیوں ہم پہ کرم فرماؤ جی

جب لالہ و گُل ناپید ہوں اور گُلشن سے دُھواں بھی اُٹھتا ہو
تزئینِ بہاراں کرنے کو کاغذ کے پھول بناؤ جی

ہم نے تو وفا کی راہوں میں یوں دیدہ و دِل قربان کیے
جیسے کہ کسی نے دریا میں کاغذ کی بہا دی ناؤ جی

اس قلبِ حزیں کو دُنیا میں ناہید وفا کرتے کرتے
ہے ترکِ محبّت کی حسرت، ہے جُرم جفا کا چاؤ جی

عشق کی گُم شُدہ منزلوں میں گئی
زندگی لَوٹ کر دلدلوں میں گئی

یاس و حسرت بھری بے اماں زندگی
آس کے ریشمی آنچلوں میں گئی

وُہ صدا جو فغاں بن کے اُٹھی مگر
خامشی کے گھنے جنگلوں میں گئی

تم سے ہو کر جُدا ایک نفس دوستو
زندگی مرگھٹوں ، دلدلوں میں گئی

کون جانے کہ اُڑتی ہُوئی دُھوپ بھی
کس طرف کون سی منزلوں میں گئی

صبحدم، رنگ نکھرا ہر اک شاخ کا
روشنی، شبنمی کونپلوں میں گئی

٭

یہ بہارِ غم اپنی، دستِ خوں چکاں اپنا
عیشِ انتہا اُن کا، حزنِ جاوداں اپنا

ہاں نہ ہم کو راس آیا کچھ سوائے خاموشی
ڈھونڈ ہی لیا آخر دل نے ہمزباں اپنا

پھر پلٹ کے خود کوئی نقش پا مٹا ڈالے
پھر کبھی تو سچ نکلے خوابِ رفتگاں اپنا

دُودِ غم کی یورش سے جل رہی ہیں آنکھیں بھی
رنگ کچھ تو دکھلائے شوقِ خوں فشاں اپنا

ایک یاد ہی اب تک راحتِ تعلّق ہے
ایک یاد ڈھانپے ہے دردِ رفتگاں اپنا

شوقِ بے ارادہ کو دخل ہے غمِ دل میں
اذن بے سبب بھی ہے محرمِ فغاں اپنا

✺

حاصلِ عہدِ تمنّا نہ مِلا
رات کے بعد اُجالا نہ مِلا

تُو تو کیا، شہر میں تیرے ہم کو
کِسی دیوار کا سایہ نہ مِلا

اُس کی چاہت میں فنا ہو جاتے
کیا کریں کوئی بھی تجھ سا نہ مِلا

زندگی چاٹ گئی تنہائی
درد کا کوئی مداوا نہ مِلا

بحرِ غم سے کبھی پایا نہ فرار
زیست کا کوئی کنارا نہ مِلا

مُدّتوں بعد مِلے تھے جن سے
ان نگاہوں میں بُلاوا نہ مِلا

پھر خیالوں میں نہ گرداب پڑا
پھر وہ مانوس سا چہرا نہ مِلا

منجمد ہو گیا غم بھی ناہید
دِل میں اُمڈا ہُوا دریا نہ مِلا

---

کچھ اتنے یاد ماضی کے فسانے ہم کو آئے ہیں
کہ جن راہوں میں اُجڑے تھے، اُنہی پر لَوٹ آئے ہیں

بڑا پیارا ہے وہ غم جس کو تیرے چاہنے والے
زمانے بھر کی خوشیوں کے تصدّق مانگ لائے ہیں

دہکتا ہے کلیجے میں کسک کا کوئلہ اب تک
ابھی تک دل کے بام و دَر پہ ہجر و غم کے سائے ہیں

ہمیں دیکھو، ہمارے پاس بیٹھو، ہم سے کچھ سیکھو
ہمیں نے پیار مانگا تھا، ہمیں نے داغ پائے ہیں

٭

ہر نقشِ پا کو منزلِ جاں ماننا پڑا
مدت کے بعد، جب بھی ترا سامنا پڑا!

اکثر نقابِ ضبط ہمیں تھامنا پڑا
جب بھی فصیلِ شب کو ہمیں پھاندنا پڑا

ہر بار بھولنے کو غموں کی اذیتیں
ہر رشتۂ اُمید، نیا باندھنا پڑا

ہر آرزو سے ہم کو مِلی تازہ زندگی
ہر آرزو کا ہم کو لہُو چاٹنا پڑا

کی تھی حرام خودکُشی میرے خُدا نے کیوں
بے وجہ زندگی کا سفر کاٹنا پڑا

✻

نغمے آہوں سے نکلتے دیکھے
لوگ غم سے بھی بہلتے دیکھے

موسمِ گُل کا فقط ذِکر نہیں
ہم نے انساں بھی بدلتے دیکھے

ہم نے تو دَیر و حرم کے رَستے
اُس کے دَر پر ہی نکلتے دیکھے

سلسلے سارے جہانِ غم کے
آپ کے ساتھ ہی چلتے دیکھے

دِل میں زخموں کا الاؤ دیکھا
نغمے ہونٹوں پہ مچلتے دیکھے

دشمنوں سے بھی ملی دادِ وفا
آگ سے پھول نکلتے دیکھے

دل کے صحرا کو کھنگالا تو کبھی
غم کے چشمے بھی اُبلتے دیکھے

میری زباں پہ نام ترا ایسے رٹ گیا
اِک ذائقہ سا جیسے زباں سے چمٹ گیا

ملنے کی آس لے کے مرا دِل جگہ جگہ
بے اختیار موجِ صبا سے لپٹ گیا

آنسُو بنا ، حجاب بنا ، مُہرِ لب بنا
اِک تیرا غم ہزار کنایوں میں بٹ گیا

تیرا خیال دھار کے آتش فشاں کا رُوپ
ضبطِ غمِ حبیب کے ایواں اُلٹ گیا

ناہید کس حبیب کا سایہ گلی میں تھا
مجھ کو اُداس دیکھ کے جو کل سمٹ گیا

✻

آنسوؤں کی ردا میں لپٹے ہم
یاد نے رکھ دیا تھا دل میں قدم

آنکھ میں چاہتوں کے غم جاگے
دیکھ کر راستوں کے ویراں خم

پاس آئے تو پیر دھو کے پیوں
پھول بنتے ہیں جس کے نقشِ قدم

بھولتی ہی نہیں ہے یاد اُس کی
جان سے کیوں گزر نہ جائیں ہم

بولتی ہیں گھروں کی دیواریں
کھُل نہ جائے کہیں سکوں کا بھرم

تیری فرقت میں پھُنک رہا ہے بدن
ہو نہ جائے یہ آنچ بھی مدھم

صبحدم یاد کے سمندر میں
ڈوبتا ہے سفینۂ شبِ غم

---

٭

دُکھ کی گُتھی کھولیں گے
اپنے آپ کو سمجھیں گے

تیری آنکھ جھپکنے میں
لاکھوں طوفاں اُٹھیں گے

جانے کس دن تجھ کو ہم
پاس بٹھا کر دیکھیں گے

سُن کے قدموں کی آہٹ
مانگ میں افشاں بھر لیں گے

دیکھیں گے بے مہریٔ دہر
چُپ کی چادر اوڑھیں گے

تیری خاطر، موسمِ گُل
کانٹے دل میں چبھو لیں گے

میری چمکتی آنکھ میں لوگ
تیری صُورت دیکھیں گے

---

مرے نوحے میں شامل ہو گئے ہیں
محل میں لوگ داخل ہو گئے ہیں

گھروں سے صحن اُڑتے جا رہے ہیں
بہت اب لوگ کاہل ہو گئے ہیں

اُڑی خوشبو دریدہ پیرہن سے
نمودِ غم کے قابل ہو گئے ہیں

کبھی تو جھانکیے اپنے گھروں میں
بہت اپنے مسائل ہو گئے ہیں

بھری بہار میں اندیشۂ خزاں بھی ہے
وفورِ تشنہ لبی ، تنگیٔ اماں بھی ہے

صحیح تو یہ ہے کہ ہم مطمئن نہ تھے خود سے
وگرنہ آبِ رواں زیرِ خاکداں بھی ہے

منافقت ہے تقاضائے عصر، دیکھ کے چل
جو ہمسفر ہے وہی تو غنیمِ جاں بھی ہے

خود اپنے آپ کو زنجیر کر کے مت روؤ
تمہارے ہاتھ سلامت ہیں اور زباں بھی ہے

نوید منزلِ نایافت، ہر قدم پر ہے
ہر ایک راہگزر، نقشِ رہرواں بھی ہے

عشق کے لاکھوں رنگوں کا ہے اک اوتار ہوا
پھرے کسی کی کھوج میں بے کل شب بیدار ہوا

تم کیا جانو ہجر کی راتیں کیسے بیت رہی ہیں
رات کا پچھلا پہر ہے ساتھی اور غم خوار ہوا

دل کی دُوری ہو تو مِلنا بے معنی ہو جاتا ہے
بن جاتی ہے بیچ میں اکثر اِک دیوار ہوا

جانے کس کے عشق میں گھائل بستی بستی پھرتی ہے
اپنا رُوپ بھی کھو بیٹھی ہے یہ نادار ہوا

ہم بیراگی شام سویرے اُس کے دھیان میں رہتے ہیں
جس کی چاہت خوشبو جیسی جس کا پیار ہَوا

مستی میں مُنہ چوم رہی ہے آتے جاتے پھولوں کا
گُلشن گُلشن بانٹ رہی ہے اپنا پیار ہَوا

لاکھوں بار دھڑک اُٹھا دل ایک ذرا سی آہٹ پر
درد کی چادر تان چکی ہے لاکھوں بار ہَوا

---

حسرتیں جاگ اٹھیں، یاس نے پہلو بدلا
اس طرح ہاتھ تری یاد نے آکر رکھا

ہم تجھے دل سے بھُلا دیں نہ کبھی یاد کریں
مل اگر جائے زمانے میں کوئی بھی تجھ سا

پھُول سا جسم دہکنے لگا شعلوں کی طرح
دل تری یاد کو بھی وصل کا ساماں سمجھا

آنکھ ہر رُوٹھے ہُوئے شخص کی جانب اُٹھی
دل ہر اک چلتے ہوئے شخص کے پیچھے بھاگا

یاد آئی تو سُلگ اُٹھے نگاہوں کے ایاغ
رات آئی تو ترے غم کا مقدّر چمکا

آس کے ہونٹوں پہ پپڑی سی جمی ہے ناہید
خُوب کھایا ہے تمنّا نے وفا کا دھوکا

---

بگڑے ہیں جب کسی کے بھی حالات بے طرح
آئی ہے بن سنور کے سیہ رات بے طرح

جب سے ہے خواہشوں کے گھنے جنگلوں کا دھیان
جی میں ہے پھر سے شوقِ مدارات بے طرح

سُنتا کبھی تو، اپنی ہی دھڑکن کی آہٹیں
کٹتی کبھی تو تیری کوئی رات بے طرح

یاد آئیں بے طرح مجھے پھر آپ بیتیاں
اِک پھول پر پڑا تھا مرا ہاتھ بے طرح

اب کے بھی کاگ چھوڑ کر پنچھی چلے گئے
اب کے بھی سُونی گزرے گی برسات بے طرح

چُولھے کے پاس کٹتے ہیں شام و سحر تمام
بگڑی ہے جب سے اپنی بھی اوقات بے طرح

---

❋

آئینہ خانے کی جانب نہ چلو
اپنی ہی ذات کے سانچے میں ڈھلو

قہر بھی صبر کی حد سے گزرا
حلق ہے خشک تو آنکھوں سے کہو

زخم چٹکیں گے شگوفوں کی طرح
زیست کو شرطِ تمنّا سمجھو

ظلم ہر حال میں رُسوا ہوگا
جانکنی کو نہ مسلسل سمجھو

گھر کی دیواریں بھی بول اُٹھیں گی
چند روز اور تماشا دیکھو

نکلو بھی بند گھروں سے ناہید
ہے لہو گرم تو ہنگامہ کرو

٭

پہلے تو اپنے درد کی گیرائی دیکھ لے
پھر حسرتوں کے باب میں شنوائی دیکھ لے

گر ہو طلب تو سلسلۂ جستجو بھی رکھ
مٹی اُڑا ہُوا کی پذیرائی دیکھ لے

اشکوں کی تھالیوں میں سجا پھر ہنسی کے دیپ
ہوتی ہے ایسے غم سے شناسائی دیکھ لے

صحرا میں یوں نہ سایۂ انساں گزیدہ بچ
لگتی نہیں ہے جسم کو پُروائی دیکھ لے

کاغذ کو چھو کے جان لے تحریر کا متن
آنکھوں سے جھانکتی سخن آرائی دیکھ لے

اچھی ہے اپنے آپ سے ہی گفتگو مگر
ناہید یوں نہ ہو کہ تماشائی دیکھ لے

---

✺

آئینے محوِ تمنّا ہوں گے
ہم تو رد کر بھی شگفتہ ہوں گے

آج ہیں نقش کی صورت ٹھہرے
کون جانے ہے کہ کل کیا ہوں گے

آگہی اپنی ہی کام آئے گی
ہوں گے پامال تو سبزہ ہوں گے

ہم اِک رنگ میں ڈھونڈیں گے تجھے
منزلوں منزلوں رُسوا ہوں گے

سخت ہوتا ہے سفر کا ہنگام
در و دیوار بھی گویا ہوں گے

یاد آؤ گے شب و روز ہمیں
دشت بھی شہر کا نقشہ ہوں گے

سرسری ربط پہ نازاں ناہید
اور وہ محو تماشا ہوں گے

٭

دِل مرا اپنے تقاضوں ہی سے ترسیدہ ہے
اس کی قسمت میں تو اب حال بھی غم دیدہ ہے

ٹھہریے تو نظر آتی ہے مقابل منزل
چل نکلیے تو ہر اِک راہ ہی پیچیدہ ہے

رات بنتی نہیں غمّازِ طلب گارِ وفا
یہ بھی تیرے ہی خیالوں سے تراشیدہ ہے

مَیں ترا عکس ہوں کب تک تُو چُھپے گا مجُھ سے
یہ مری ذات تو تجُھ سے ہی تراشیدہ ہے

جسم پتھّر ہے، ہر اک چوٹ کو سہہ جائے گا
دِل سمندر ہے، ہر اِک موڑ پہ شوریدہ ہے

پیلی دُھوپوں سے بچھڑتے ہوئے سایو! ٹھہرو
زندگی بھی تو چراغِ غمِ ژولیدہ ہے

وحشت و غم کو تعلّق کا تماشا نہ سمجھ
دل وہ صحرا کہ سرابوں سے بھی ترسیدہ ہے

عمر بھر جاگتی آنکھوں کے تعاقب میں رہو
خوابِ ہستی ہے یہاں وقت بھی خوابیدہ ہے

✻

محرومیوں کو ذرا سے پئے آزار ہونے دو
کچھ اور راہِ زیست کو دشوار ہونے دو

ڈھونڈو وہ چیز جس کا سلیقہ تمہیں بھی ہو
ہنگامۂ طرب پسِ دیوار ہونے دو

ٹوٹے گا پھر سکوتِ گُلِ دید ایک دن
ہنگامہ خیز صُبح کے آثار ہونے دو

کچھ روز تم بھی صبر کرو، جی کڑا کرو
کچھ روز اس طرف سے بھی اصرار ہونے دو!

آ جائے گا وہ راہ پہ سُن کر تمہارا حال
قربت کی آنچ سے اسے گلزار ہونے دو

رہنے دو اپنے نام کی تختی ہی اس جگہ
دو روز اور ہم کو گنہگار ہونے دو

دیکھیں گے کون کون مسیحا بنے گا پھر
ناہید ایک روز کو بیمار ہونے دو

✻

ہمیں تو جینے کی اُمید کا بہانہ مِلا
فریبِ دوست تجھے آج بھی ٹھکانہ مِلا

دبا گیا کوئی ماضی کی آگ کی بھوبھل
چمن کی آبرُو رکھنے کو شاخسانہ مِلا

تمام رات منڈیروں پہ چاندنی دہکی
تمام رات کسی گھر میں رتجگا نہ مِلا

کنوئیں بھی ختم ہوئے پنگھٹوں کا دَور گیا
یہی سبب ہے کوئی تہہ میں جھانکتا نہ مِلا

ہماری عُمر تو ہے بیل عشق پیچاں کی
ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ مِلا

تمام رات رہا آندھیوں کا شور مگر
کسی مکان کی کھڑکی کا در کھُلا نہ مِلا

تمہارے شہر میں ہر اِک اُداس تھا لیکن
کسی بھی لب پہ مگر حرفِ مدعا نہ ملا

دِل بھی اندھے کی طرح اس سے لپٹنا چاہے
شعلہ تا نبضِ جگر خُوں میں اُترنا چاہے

کج رَوِش ہمدمِ غم، تابِ تمنّا پرکھے
نقشِ پا دیکھ کے رستہ ہی بدلنا چاہے

خُشک آنکھیں ہیں تو بے رنگ رہے گی صُورت
چشمِ نم ہو تو ہر اِک رنگ نکھرنا چاہے

روشنی رنگ نہیں، دُھند کا دروازہ ہے
رنگ وہ ہے جو دھنک بن کے بکھرنا چاہے

شب کے سُوکھے ہوئے گالوں پہ وفا کی سُرخی
شمعِ غم پھر تری یادوں سے بہلنا چاہے

بند ہوں در تو یہ دیوار گرا ڈالے گا
دل کا سیلاب کناروں سے نکلنا چاہے

ربط ہے ٹوٹتے تاروں کا دلوں کے غم سے
جاگتی آنکھ میں آنسو بھی ٹھہرنا چاہے

اُس کو پانے کی طلب آپ ہی دیوار بنے
دل کی آشفتہ سری جاں سے گزرنا چاہے

یہ بھی کیا رسمِ وفا ہی کی کڑی ہے ناہید
بادلی کرکے مجھے، مجھ سے بگڑنا چاہے

# دوہے

✻

نا میں سُگھڑ نا صُورت والی، کِس کا مان کرُوں ری
جَل گندا ہے اپنے مَن کا، کیا بلیدان کرُوں ری

چیت جُدائی کا انگارہ، ساون آس کی بندی
کاتک چڑھے تو گھر آجیو، ساجن مَیں ہُوں اکیلی

جاگتے میں اِک سپنا دیکھا، جیون کا سُکھ دیکھا
دوج کے چاند میں سکھیومَیں نے پریتم کا مُکھ دیکھا

ہریالی ہے جیون ریکھا بڑھتی اور پنپتی ہے
جیسے تیرے دھیان کی ندّی بن ساون بھی چڑھتی ہے

میں بہری تھی کاگا بولا، سُن نہ سکی سندیس
دل کہتا ہے کل آئیں گے پیا بدل کے بھیس

ٹھنڈی رات اور ٹھنڈا بستر سکھی ری کاٹنے آئے
لوگ کہیں جو دُکھ سانجھے ہوں دل ہلکا ہو جائے

صُبح ہُوئے جگ بیت گئے ہیں کب سے رَین اڑی ہے
سُوکھ گئے ہیں لب پھُولوں کے ایسی اوس پڑی ہے

کیونکر پیار بڑھائے سکھیو، سوت کا رشتہ دُنیا میں
کبھی نہ ہووے اُتھلے کنوّیں کا پانی میٹھا دُنیا میں

ریشم سے بھی اُنگلی کٹ گئی، پتّی کاڑھوں کیسے
جیون گگری بھاری لاگے، بوجھ اُٹھاؤں کیسے

اُڑتی چڑیا ٹھہر ذرا مرے دل کی کہانی سُن جا
روتی چھوڑ گیا مورا بھائی مُنہ سے نہ بولی میّا

بھائی مرے پردیس سُدھارے بہنیں ہوئیں پرائی
کس سے جا کے کہوں کہانی ساجن ہے ہرجائی

آنکھیں سُوکھیں، پتّھر بن گئیں پھول بنے انگارے
جس دن سے تم نین چُرائے، نیند نہ آئی دوارے

تپتے لمحے، دہکتے چہرے، سب کچھ دھیان میں لاؤں
پتّی پتّی چائے توڑوں، دِل کا بوجھ ہٹاؤں

کاجل بن کے بسے ہیں سجنا اکھین بیچ ہمارے
تم ہی کہو پھر کیسے سکھیو کاجل بیچ سمائے

آنکھ میں سپنے تیرتے جائیں جس دم دھیان جگے رے
رنگ بھریں کومل آشائیں اندر سبھا سجے رے

سُوت کے کچّے دھاگوں جیسے رشتے پہ اتراؤں
ساجن ہاتھ بھی چھُو لیں تو میں پھُول گُلاب بن جاؤں

گوری رنگت دیکھ کے میری، نام پوچھنے آئے
وہ بھی جو سارے گاؤں میں اپنے پہ اترائے

دیکھ کے روئیں، رو کر دیکھیں ہم تیری تصویر کو
کشتی بھرے تو ڈُوب ہی جائے کیا کہیے تقدیر کو

کون بڑھے باتوں سے آگے کون کرے ہے گیان
کس نے بنایا آج تلک بھلا دریا بیچ مکان

تکیہ بھیگا، سانس بھی ڈوبی، مرجھائی ہر آس
دل کو راہ پہ لانے کی ہر آس بنی سنیاس

سچّا پریمی ہونٹ نہ کھولے سدا جلائے آپ
پریت ہے ایسی بھٹی جس سے کبھی نہ نکلے بھاپ

بھائی مرا پردیس سے آیا، ماں نے بنائی لسّی
بیچ صحن میں پلنگ بچھایا، قسمت چمکی گھر کی

بچّہ میرا آئینہ ہے، دل سے لگا کے رکھوں
پھول سے نازک مکھڑا اس کا، اپنے پیار سے دھوؤں

بیاہ کے جس گھر جاؤ بہنا، رہو وہیں کی ہو کے
امر ہوئی تھی پریت میں سوہنی سب کچھ اپنا کھو کے

ساری رات میں بیٹھی جاگوں چاند بھی اُٹھ کے دیکھے
پریتم پاس ہے میرے لیکن لمبی تان کے سوئے

آنکھ کی پُتلی سب کچھ دیکھے، دیکھے نہ اپنی ذات
اُجلا دھاگہ مَیلا ہووے لگیں جو مَیلے ہات

پریم کیا اَد بساتھ نہ چھُوٹا کیسے تھے وہ لوگ
ہم نے تو پیاروں کا اب تک دیکھا نہ سنجوگ

دُھوپ پڑی تو شبنم اُڑ گئی، وقت پڑا تو تم کھو گئے
کیسی رِیت چلی یہ اندھی، کوکھ جنے دُشمن ہو گئے

اُلجھے سُوت کی انٹی دل ہے، سُلجھاؤ تو ٹُوٹے گا
بھرا کٹورا لے کے چلو تو قدم قدم پہ چھلکے گا

مَیں وُہ پھُوٹی ڈھوبری کوئی نہ رکھے پاس
دے گئے مجُھ کو ساجنا بن کارن بَن باس

بیٹیاں چڑھتی دُھوپ ہیں آنکھیں دیکھ چُندھیائیں
جہاں جہاں بھی قدم رکھیں یہ پھُول وُہیں اُگ آئیں

جتندن پھُول سجیں ہر پگ پہ، دیوے ہر ہر دوار
بھیّا مرا جب بیاہ کے لائے البڑ سُندر نار

میکہ تو پنجھی کی جھاڑی، بیٹیاں سجرے پھُول
سال کے سال بُلانا میکے۔ جائیں نہ بھیّا بھُول

میری چمکتی لونگ کا کوندا، جہاں پڑے
ہل والے ہل روک لیں، راہی دیکھیں کھڑے

مٹّی کے تودے بھی اب تو بن گئے ہیں بھگوان
پانی جب سے عطر بنا ہے، اونچی ہے دوکان

جسم مرا آنکھیں بن جائے، ٹک ٹک دیکھوں ساجن کو
سوکھے کھیت پہ پانی برسے، چین بھی آئے برہن کو

نیا تو نو دن چلے گا بی بی، پھٹے کو سینا سیکھو
رُوٹھے جو بھی منا کے اس کو، پیار میں جھکنا سیکھو

روشنی ہو تو سائے جاگیں، بادل سے مینہ برسے
بھائی ہی جب بہنوں کو بھولیں، کون ہے کس کا ہووے

---

# بے نام مُسافت

# ترتیب

# حرفِ ندا

طفل۔ آموختہ پڑھ کے بھی ہراساں ہوگا
سچ تو ہے
نعمتِ موہوم۔ کبھی لذّتِ بے پایاں کا منبع نہ بنے
جانتے پہلے بھی تھے
رمزِ ملاقات کی یہ کوہ کنی
آبِ تسکیں کی فسوں سازی تو کیا کر پاتے
کرمکِ حرص کا الحاقی تعلق نہ بنے
یہ جنوں سازیٔ احساس،
حبابوں پہ کرے عرصۂ ہستی کو رقم
تیرے جانے کو بھی آنے کا بہانہ سمجھے
باقی ہر شے کو ترے عکس کا جویا سمجھے

یہ اچٹتی ہوئی نظروں میں فسانوں کے خلاصے
یہ خیالات کی ریزش
یہ فنا اور بقا کے رشتے
جو کہ ہیں
اپنی حدوں میں محصور
بڑھ کے آ ملنے کی راہیں بھی نہیں
اور جو مڑ کے پلٹ آئیں، نگاہیں بھی نہیں
لحظہ در لحظہ، وہی آنکھوں میں گھلتی آنکھیں
وہ ہرے بڑھتے نہالوں کی طرح
جذبوں کی حدّت
وہ الجھتی سانسیں
میرے مولا! مجھے ان خوابوں کو یوں جوڑتے رہنے کی تمازت سے بچا
نیند میں جاگتے رہنا بھی ہے
خورشید قیامت سے سوا
میرے مولا! مجھے اس قربِ قیامت سے بچا
اس کی تصویر نہیں، شکل دکھا!!

---

# کچھ اگر ہے تو ملے

خواب میں آئے، مجھے مجھ سے ملائے
مجھے سیرابیٔ دیدار سے گلزار کرے
خواب وہ خواب کہ ہو حرفِ تمازت کا فسوں زاد
خواب وہ خواب کہ بن جائے شکستِ بے داد
کبھی رنگ گھلے سُرمئی شام میں ایسے کہ شفق
خون کی آنچوں سے دہک کر پھیلے
آتے جاتے ہوئے لوگوں کی تگ و تاز بھی
اندیشوں سے انجان لگے
جاگے خدشے بھی، خد و خالِ تمنّا سے ہوں مبہوت
ہر اک عزلتِ جاں، شوق کی شمشیر لیے

جھیل کے ساحلِ پایاب کو غارت کر دے

مرقدِ حیلۂ بے سُود مٹے

کُچھ اگر ہے تو مِلے

کوئی گر ہے تو چلا آئے، مجھے مُجھ سے مِلائے

مجھے سیرابیٔ دیدار سے گُلزار کرے

---

# سلامت گہہِ خواب کو روند ڈالو

آگ اور برف کے درمیاں، پگھلے لاوے کی صُورت
یہ آنکھیں،
جو دِل کی کہی اَن کہی ہوتے دیکھیں
برس لیں تو اچھّا ہی ہو
نمائش کی تحریر سے، زندگی کی روایت نبھاتے
بہت عُمر گزُری
بہت حوصلوں کی شکستوں کو پندار نے خامشی کے کفن میں لپیٹا
بس اب راستوں میں درختوں کی پرچھائیوں کا سندیسہ سمجھ لو
وہ دیوار گرتی نظر آرہی ہے
صبا نے کہا، پھُول کِھلتی ہُوئی رُت میں سونا تو دیوانگی ہے

نظر تو اُٹھاؤ۔ یہ دیوار و در پہ اُگے سبز پتّوں کی نَس نَس پہ نئے سبز پتّے
یہ سُوکھی ہُوئی شاخ پہ بھی ہری کونپلوں کے نشاں
اجنبی نام سے، شکلِ مانوس کے آ نکلنے کے شاہد ہیں
اُٹھو اور بُھلا دو

وہ بے مہر ساعت
کہ جس نے تجھی خلوتوں کی سیاہی کو
حدت کی چُندھیانے والی شعاعوں سے، پگھلے ہُوئے برف کی شکل میں
بہہ نکلنے کے ہر راستے کو خرد زاد، سنگِ ملامت سے اَٹ کر
سلامت گہہِ خواب کو روند ڈالا

اندھیروں کی تائید، تقدیسِ خوں کی علامت نہیں
شوق کو، عزم و امید کی سُرخ جھنڈی کے فتوے کی حسرت میں
تسلیمِ ایذا پہ مائل کرو گے
تو آنکھوں کے حلقے، تمہاری رفاقت کا نوحہ لکھیں گے

---

# خوشنودیٔ غم

بے دِلی، خُبثِ مکافات کا خمیازۂ آگاہی ہے
عجز کے نام پر پھیلے یہ طلسماتِ نیاز
جادۂ شوق کو بے نام مسافت کا نشاں بتلا کر
تتلیوں کی طرح پھر خواب کی پرچھائیں بنے
لذّتِ وہم کو بھی کشفِ تعلّق کا بھروسہ دے کر
جذبِ اِدراک کے حیلے کو ابد ساز تعلّق کی نمائش
کے خلاؤں میں بھٹکنے کے لیے
دست و پا، باندھ کے، آنکھوں کو مگر دیکھتے رہنے کی سکت دے کے
چلے جاتے ہیں

آنکھ کہ دیکھتے رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پاتی

دیکھتی ہے کہ یہ صحرا، سدا صحرا تو نہ تھے
یہ جو صحرا میں سرابوں کے نشاں ملتے ہیں
یہ بھی افسونِ سکوں رنگ کے آسیب ہیں
جاں سوزی کے آثار،
جہاں پائے خرد بھی لرزے
یہ فقط ایک ہی لمحے کو حقیقت کی حدیں توڑ کے
مٹھی میں دبوچے ہوئے بڑھنے کو
زماں اور مکاں سے کہیں آگے کا زمانہ سمجھیں
پھر جو بیتے اُسے غم دیدہ تعلق کا خرابہ سمجھیں

پس کہ ممکن نہیں اس آگ کے دریا سے گزرنا اپنا
کیا یہ ممکن ہے کہ یہ مُہرِ حجابات وہ دیوار بنے
عجز کی غایتِ صد رنگ نہ کھُلنے پائے

# فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن

یہ بھی نعمت ہے کہ دیوانگی
ترتیبِ سراسیمگی، اندیشۂ حسرت کے سیہ خانوں سے
احساس کی قندیل لیے
رُتبۂ قرب کی جلوت میں
بہر طور اُجاگر تو ہوئی

یہ بھی نعمت ہے کہ تنہائی کی سوزش
طلب و زشت کی دلدل سے گزُر کر
کسی اِک لمحۂ محسوس میں محبوس ہوئی

یہ بھی نعمت ہے کہ احساس نے پُوچھا مجُھ سے

تم کو منظور ہے زندانِ بلا ہو جانا؟
نارسائی کے تحیّر میں فنا ہو جانا؟

یہ بھی نعمت ہے کہ یہ چشمِ نگوں سار،
مہک اور جنوں خیز بہاروں کو نقابوں سے
نکلتے ہوئے دیکھے ایسے
کہ ہر اک لفظ، کہ تمثیلِ تمنّا کے لیے مشکل تھا
پھر تو پیکر کی طرح مجھ سے کہے،
روشنی رُکتی نہیں، آنکھ جھپکنے سے بھلا کیا حاصل!!

---

# کچّے دھاگے

ہم حقیقت کے طالب
حقیقت سے آنکھیں چُرائے ہُوئے
دُور تک بھاگتے ہیں
اُٹھاتے ہیں وہ بارِ ہستی کہ جس کی
طلب بھی نہیں، جُستجو بھی نہیں
چاہتے ہیں اُسے، جس میں چاہت کی خود خُو نہیں
منتظر ہیں سدا اُس کے
جس میں وفا کی ذرا سی بھی خوشبُو نہیں

ناصبُوری کی یہ داستاں

خود ستائی کا اِک آئینہ ہے
ہم اپنے ہی اندر چُھپے ہر خلا کو
ہیروں کی صُورت جگاتے ہیں
اور اپنے بدن کے لیے وہ پیالہ بناتے ہیں
جس میں ، ہمارے سوا ، سب کے چہرے ہوں ننگے
ہر اِک شکل ، اصلی شباہت لیے
مُسکراہٹ کے مصنوعی جامے سے نکلے
ہر اک ہاتھ ، دستِ ستم کی نمائش کرے

وہ جو پھر اِس اسیری سے اُکتا کے بھاگے
اُلجھ کے گرے اوندھے مُنہ اِس طرح
کہ حقیقت کی اقلیم دھوکہ لگے !

---

# کشیدِ شب

آج کی رات بھی پھر خواب جگائیں گے مجھے
پھر وہ کروٹ سے خیالوں کے تسلسل کو مٹانے کی کشیدِ کوشش
جسم کے درد کو سلوٹ میں سمو کے
وہی بستر پہ تڑپتے ہوئے، مہجوریٔ جاناں کو
کبھی آہ، کبھی سانس کی گہرائی میں، شل کرنے کی
سعیٔ ناکام

یہ بھی معلوم ہے
یہ نیم رسی، فہم کی دیوار تلک جست
یہ سائے کی تصویر، کسی شکل و شباہت کے تسلسل کے نشاں ہیں لیکن
ناصبوری، یہ بدن توڑتی انگڑائیاں

ہونٹوں پہ مہکتی لرزش
بات کو ربط کے آہنگ میں لانے کی طلب
میرے سینے کا دُھواں، آنکھیں شرابور کیے
ہر بُنِ مُو کو ملاقات کا جویا کر دے

آنکھ چڑھتے ہُوئے دریا کی طرح ہے پُرآب
پاؤں پھسلے ہے تو پھر سانس کا رشتہ نہ رہے
ہم تو چاہیں، مگر اس دل کو یہ اچھا نہ لگے
جاں کنی، حد سے بڑھی، چارہ گرو، کچھ تو کرو!!

# خزاں کا گیت

مجھ کو دیکھو تو پھر اس خیمۂ حرماں سے نکل کر دیکھو
دیکھو تو پیلے گلابوں سے بھی بڑھ کے
مرے رخسار کی پیلی رنگت
دیکھو وہ آنکھیں جنہیں خواب پرست،
جھیل کہا کرتے تھے
اب وہی آنکھیں ہیں، غاروں کی طرح سے ویراں
اور وہی ہاتھ کہ جو تازہ شگوفوں سے بھی،
نازک تھے کبھی
آج سوکھی ہوئی روٹی کی طرح خاکستر
اور وہ نقشِ کفِ پا

کر چکے رستوں کو گلابی کر کے
دائمی رقصِ بہاراں کے امیں ہوتے تھے
آج ہیں اُجڑے دیاروں کی طرح
تم کہ ہو خیمۂ حرماں میں مقیّد اب تک
خود کو اک سایۂ شب کہتے ہو
اور پھر اپنے ہی سائے سے گریزاں بھی ہو
جھانک تو لو کبھی خُم خانۂ دِل کے اندر
اور کبھی دُنیا کا نیرنگ تماشا دیکھو
کُچھ نہ ہو تو یہ مرا اُجڑا سراپا دیکھو

---

# شکستِ رنگ

مجھے مغلوب کرنے کو
مرے جذبات کے اندوختہ حیلوں کو اُکسا کر، وہ کہتے ہیں
تری آنکھوں، تری باہوں میں
جنّت کے شگوفوں کی مہک
آسائشوں کی لذّتوں کا لمس رہتا ہے:
مگر اب خواہشیں پاؤں پکڑتی ہیں
نئے خوابوں کے جالوں میں اُلجھتے سانس کہتے ہیں
کبھی تو پھیلے ہاتھوں کے تموّج میں سمٹ جانے کی ترغیب و اشارات کو
گزرتی ساعتوں سے ماورا ایسے زمانوں کی
فضا سمجھو

جہاں سائے سمٹ کر ایک ہوں
تسلیمِ جاں تک کی ہمک جاگے
کبھی ٹھہرو
کبھی بڑھتی ہوئی موجوں سے ہم آغوش ہوتی
تیز لہروں کی فنا ہونے میں
یک جانی کی پنہاں سرخوشی دیکھو،
کبھی اس جبرِ بے انداز کے پھندے سے نکلو،
اور رچو اس میں کہ وہ خود تم میں رچنے کے لیے بیتاب، دائم ہے

رچاؤ ہاتھ میں اس طرح مہندی
لوگ کہہ اُٹھیں
اسے چاہت کی بے پایاں تپش کی حدّتیں گلزار کرتی ہیں
رچاؤ ہاتھ میں اس طرح مہندی
یہ تپاں، ننگی ہتھیلی، اپنا پیکر
سُرخیوں سے ڈھانپ لے ایسے
کہ دل کے تشنگی آثار جذبے بھی

تذبذب کے دھندلکوں سے نکل کر
روز و شب کی نغمگی کو جذب کرنے پر ہوں آمادہ۔
مگر رنگوں کو آخر،
جبرِ بے رنگی کا خمیازہ مقدّر ہے
اگر یوں اپنے ہاتھوں سے لگائی مہندیوں کے رنگ اُڑ جائیں
تو پھر حسرت زدہ آنکھیں کسے چاہیں
کسے پابندِ در سمجھیں
کسے ڈھونڈیں!!

---

# اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْن

بھرے شہر میں اپنی تنہائیوں کو گلے سے لگائے
بہت خوش تھے ہم، کہ تحیّر کے صحرا میں
گم مائیگی کے سوا کچھ نہیں
زندگی تیرگی کے سوا کچھ نہیں
قناعت کے تابوت میں
شوق کے ہر ہیولے کی تدفین ہم نے ہی کی
ہمیں نے طلسماتِ خواہش کی دلدل کو
حکمت زدہ استواری کے ملبوس میں ڈھانپ کر
ہر بدلتے افق سے شناسا کیا

زندگی کا کنول پتّیاں پتّیاں ہو کے

پانی پہ تازہ ہے اب بھی
مگر وہ کنارا کہ جس پہ مچلتے ہُوئے
ہاتھ ، پانی
رُگل و گُل
ہر اک بہتی کشتی کو چھیڑیں !— بہت دُور ہے !!
زندگی کا نشاں اس سے بھی دُور ہے !
قہقہے ، مُسکراہٹ
سخن فہمیوں کے در و بام نعمت ہیں
ان سے بھرو جھولیاں !!
خرقۂ شوق ، دریوزۂ غم بھی ہونے کے قابل نہیں
اب ہنسو
پھر ہنسو
یوں ہنسو
کہ کنوَل ، پتّیاں پتّیاں ہو کے پانی پہ تازہ رہے !!

# قصّہ سوتے جاگتے کا

تمنّا سے مبہُوت ہو کے، دُعا ساز حسرت نے
مُجھ سے کہا تھا :
مرے دُکھ کے ہر مورچے پر، مجُھی کو
کبھی زندگی کے حقائق سے،
اور کبھی اپنی ہر پیاس سے
روز و شب، جنگیں لڑنی پڑی ہیں۔
مری حسرتِ جاں
تجھے تو خبر ہے
متانت کا احرام، میرا لبادہ نہ تھا
پرمسیحا نفس دستکوں کو
ہواؤں کی شوخی پہ محمول کرتے ہُوئے

خندقِ دِل میں چھُپ کے
ہراِک سر اُٹھاتی تمنّا کی آنکھوں میں
بے رحمیوں کی سلاخیں چبھوتی رہی ہوں

مُجھ کو معلوم ہے
گر دعا ساز حسرت
مرے ہر الم، ہر تذبذب کو
مجبوریوں کی المناکیوں سے نکالے
تو اس خاک سے خوشبوئیں پھُوٹ اُٹھیں
معانی کے صحرا میں چشمے ہوں جاری
وہ اولادِ آدم کا طوفان اُمڈے
ہر اِک در، ہر اِک بام
مجنونِ خود رفتہ کی گردنوں سے پٹا ہو،
اگر تو کہے اے دُعا ساز حسرت
تو مَیں پھر تمنّا سے مبہُوت ہو کے
سجاؤں لب وچشم
جشنِ ارادت کا ساماں کروں!

# آگہی

پلے تھے ہم کوٹھڑی کے اندر
کہ جس کی دیوار ٹیڑھی ہو کے
ہزار کونوں میں بٹ چکی تھی
کہ جس کی کڑیاں ہماری ماں کی کمر کی صورت جھکی ہوئی تھیں
کہ جس کا دروازہ، تیل سرسوں کا پی کے کھلتا تھا، بند ہوتا تھا
اور کواڑ جس کے، ہزار چھیدوں کا آئینہ تھے
مگر وہی کوٹھڑی
جہاں پہ ہوا گزرنے کا راستہ بھی کوئی نہیں تھا
ہماری بالیدگی کا منبع بنی

ہماری ماں نے ہمیشہ روٹی پکائی ایسے

کہ ایک تھا پیٹ میں تو اِک
گود میں ہُمکتا
مگر نہ حرفِ گراں کبھی اُس کے لب پہ آیا

مَیں آپ ماں ہوں
مگر مرے لختِ جاں کو ،
آیا کی گود کی گرمیوں نے پالا
مجھے تو آرام ہے ، کہ ہر روز مُنہ اندھیرے
وہ سامنے والی بیکری سے
منگا لوں مَیں ناشتہ جو چاہوں
پلک جھپکنے میں ، جا کے بازار سے خریدوں
جو چیز چاہوں
مجھے خبر ہے
اگر یونہی ، میری ماں کی صورت
مری کمر بھی جُھکی تو کوئی نہ ساتھ دے گا
نہ ممتا کے مزار پر فاتحہ پڑھے گا

غرض کے بندھن ہیں سارے رشتے
نہ مامتا نہ دلار کچھ ہے
نہ تیرا میرا ہی پیار کچھ ہے۔

# طلسم آباد کی ایک شام

میں جو دوچار ہوئی خود سے
تو دیوانہ ہنسی تھی محور،

حیلۂ جاں تھا، جہاں تابیٔ حیواں کا طلسم
بات کے رنگ تھے
رنگوں کے تھے منظر اتنے
کہ ہر اِک رُخ میں تھے رُسوائی کے جلوے رقصاں
ہر بُنِ مُو میں تھیں، ترسیدہ اُمنگیں لرزاں۔

اب یہ افسانۂ خود
لب پہ اگر آ جائے

ہر تمنّا کے لہو سے وہ قیامت جاگے
کہ ہر اِک سنگِ گراں
ریزۂ بے جان بنے ،
زیست کو رشتۂ آزار نیا مل جائے
مجھ کو آ کے مری تصویر کوئی دکھلائے
پھر طلسماتِ عدم زاد بنیں حیلۂ جاں
تاب ، تسلیم کی کلیاں مہکیں
پھر ہنسیٔ رنگ بنے ، نُور بنے ، صُورتِ مبہُوت بنے ۔

# مدِّ مقابل

نویدِ دید سے تمہیدِ گفتگو کی طلب
ہے فاصلوں کے حجابوں کی اوّلیں مقراض
ہے زندگی کے سرابوں کا سُرمگیں احساس

جفا فروش، یہ قرضِ طلب ہے رشتۂ جاں
یہ شوقِ نفس نہیں اور تلاشِ لمس نہیں
مَیں جانتی ہوں کہ یہ رشتۂ ہوس بھی نہیں
مگر یہ لُطفِ مسلسل عذاب ہے جاں پر
مرے حریف بنو تو مَیں تم کو چاہوں بھی!!

# طلوع

طلوعِ وحشت عجب سماں تھا
برہنہ شاخیں بھی سرکشیدہ
نژادِ امّید کے فسوں میں
خزاں کے عفریت کو کچل کر
دبے قدم آگے بڑھ رہی تھیں
دراز مدّت سے، بند در سے
گراں ہوائیں نکل رہی تھیں
ہر اک غلافِ سکوت،
بوسیدگی کا آئینہ بن رہا تھا
دراز سائے، سحر نما شام کے دھندلکوں
میں چھپ گئے تھے

# عکس نما

ہم وہ معصوم تھے
جن کے لیے اِلہام ہر اک فقرہ تھا
ہر چمکتا ہُوا چہرہ تھا خُدا
ہر مہکتا ہُوا دامن، فردوس
ہر نظر گوشۂ اُمید و خبر
ہر قدم مژدۂ تمہیدِ جزا

ہم نے جب آنکھ کی تحریر کو پڑھنا سیکھا
ہر چمکتے ہُوئے چہرے کی جبلّت ڈھونڈی
ہر مہکتے ہُوئے دامن کو پکڑنا چاہا
ہر نئے نقش سے قسمت کو سمجھنا چاہا
جذبِ موہُوم تھا افشارِ گلو

شوق زنجیر تھا
اُمید سزا تھی اپنی
چاہتیں دام تھیں
آہٹ بھی صدا تھی اپنی
لب نہ ہلتے تھے
نہ آنکھوں کے دِیے جلتے تھے
لمحے سہمے ہُوئے، چُپ چاپ گزُر جاتے تھے
نقشِ محبُوب، ابُوالہول نظر آتے تھے

اب تو فرخندہ جفا کار ہیں ہم
اب تو پڑھ لیتے ہیں ہر سادہ ورق کی تحریر
اب نہیں کرتے وفا کی تقصیر
اب ہر اک شخص سے ملتے ہیں بدل کر شکلیں
اپنے قابو میں ہیں اب فتنۂ شب کی سوچیں
اب ہمیں خوفِ ہلاکت بھی نہیں
اب کوئی آئینہ، معیارِ عدالت بھی نہیں

# دشتِ صبا کا سپنا

ہم بھلا کیوں کششِ اصل سے محروم رہے
کیا ہمیں خود ہی اذیت سے محبّت تھی بہت
یا ہمیں مرحمتِ غیر کی حاجت تھی بہت
یا کہ تھا فاصلہ ایسا کہ قدم ساتھ نہ اُٹھ سکتے تھے
یا کہ مخفی تھا مرا حال تری آنکھوں سے
یا مری خود نگری طوق بنی میرے لیے

کوئی سُن لے تو کہے
دشت میں جا کے پکاروگے تو محرومِ صدا
اشکِ گلابی بن کر
تپتے رُخسار کی تقدیر ہی بن جائے گی

ہر سُو پہنائی مفقود نظر آئے گی
تم جسے چاہتی ہو
اُس سے مِلو یا نہ مِلو
اس کی وفا شیوہ طبیعت کو سمجھ لو تو
مطالب سے معانی کی وہ دُوری مِٹ جائے
جو سُبک فہم تعلّق کو
حسابوں کے مباحث میں گرفتار کرے

# وحشت گہِ شوق

ہم کہن سالہ شبِ غم کے مجاور اب تک
ہیں اساطیر کی دیرینہ روایات کا عکس،
ہم میں وہ جراْتِ بے تاب کہاں ہے کہ ملے
خواب میں عکسِ رُخِ یار کا لطف
چشمِ بیدار میں ٹھہرے
ترے دیدار کا لطف
در میں دیوار کی صورت جاگے
تیری آنکھوں میں محبّت جاگے۔

تنگیٔ چشم سے ظاہر کا تھا نقشہ یہ مگر
آتشِ شوق تھی ہر صورت و امکاں سے سوا

نام ہی اس کا تھا نیرنگیٔ ارماں سے سوا
سالہا سال کہ جس نے
مری آنکھوں میں حجابوں کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کو روکے ا
جس نے بیگانگی آنکھوں پہ سجائے رکھی
اور پھر لفظ کو معنیٰ سے جُدا یوُں رکھا
جیسے مَیں شوق کی تحریر سے ناواقف تھی
جیسے دو چوٹیاں گوندھے ہُوئے وہ لڑکی تھی
جس کی محبُوبہ ہو اُستانی کوئی
جس میں جاگے نہ جوانی کوئی

---

# پچھلے پہر کی سوچ

دُور تک سلسلے ہیں تری دید کے
حرص و اُمّید کے
منزلوں منزلوں ایک سے مرحلے
شوقِ تمہید کے، ضعفِ تائید کے
کُو بہ کُو جانکنی،
شاخساروں پہ پھیلی ہوئی چاندنی۔
دم بدم زندگی
بال کھولے ہُوئے، چشمِ پُرنم لیے
جا بہ جا
دِل کے تاروں کی لرزیدگی، دلنوازی کی آسُودگی

یم بہ یم

آنکھ میں ٹھہرے اشکوں کے صحرا نما سیل ہیں

عمرِ درباختہ کو چھپانے کے لاکھوں قرینے

بشارت کے آہنگ سے نابلد ہیں

# اثبات

میرے ویرانۂ تن میں جاگا
زیست کا کامنی احساس
سبک ساریٔ ساحل کا فسوں
اور بے پایاں اُمڈتی ہوئی لہروں کا زبوں
مجھ سے پوچھا مرے ہر انگ نے
اب تو بولو!
کیا تمہیں پھول کے کھلنے کا سبب ہے معلوم
مَیں ہنسی
اور مچی صحن میں دھوم

# نفی

مَیں تھی آئینہ فروش
کوہِ اُمّید کے دامن میں
اکیلی تھی زیاں کوش
ثریا کی تھی ہمدوش
مجھے ہر روز، ہمہ وقت تھی بس اپنی خبر
مَیں تھی خود اپنے میں مدہوش

میں وہ تنہا تھی
جسے بیر ملانے کا سلیقہ بھی نہ تھا
مَیں وہ خود بیں تھی
جسے اپنے ہر اک رُخ سے محبّت تھی بہت

مَیں وہ خود سر تھی
جسے "ہاں" کے اُجالوں سے بہت نفرت تھی
مَیں نے پھر قتل کیا خود کو
پیا اپنا لہُو ، ہنستی رہی
لوگ کہتے ہیں ہنسی ایسی سُنی تک بھی نہیں

---

## روایت نہ ٹوٹے

ہم روایات کی کہنہ صدیوں کے پربت تلے
وہ گھنے سبز جنگل ہیں جو
بے پنہ شاخ در شاخ تابندگی
تازگی کے تموّج سے سنولا کے
خود ہی جھلس جائیں
ایسے جلیں —— ایسے جلیں
کہ فقط دُور تک کوئلہ کوئلہ ہی دکھائی دے
اور تازگی کی نمو
خاک سے بھی گواہی نہ دے
وہ مقدّر کے اچھے

کہ جن کو جلاپے کی مدّت گزرنے پہ
اِن کوئلوں کی جگہ ، ہیرے موتی مِلے
وہ مقدّر کے اچھّے
کہ جن کی دُعائیں ، زمیں کی تہوں میں دبیں
تو کہیں سونا چاندی بنیں
وہ مقدّر کے اچھّے
کہ جن کے بدن ، کھولتے خوں کے چشمے تھے
اب بھی ہیں
پارے کی کانوں کی صُورت کہیں
تو کہیں ۔ ایسے بھی سخت جانوں کے ہیں سلسلے جا بجا
جن سے فولاد کا نام پائندہ ہے

وہ جلن جو کبھی تازگی کے تموّج سے پیدا ہوئی
ہے مقدّر کی تحریر ایسی کہ جس کی جلن ابتدا
انتہا بھی جلن
جلتے رہنے کا یہ سانحہ بھی جلن
انجمن ، انجمن

چودھویں رات کے چاندنے بھی کہا
بھیگی برسات کے رعدنے بھی کہا
تم وہی ہو کہ جن کو چٹخنے کی مہلت بھی ملتی نہیں
اب روایت یہی ہے
نبھاؤ ـــــ ہنسو
مُسکراؤ ـــــ جلو
ہر اِک زرد چہرہ گلابی کرو
مگر یاد رکھو
روایت نہ ٹُوٹے
تموّج کی ہر تازگی لاکھ چھُلسے
روایت نہ ٹُوٹے

# زوالِ استحصال

یہ ہاتھ جن میں رگیں اُبھر کے
خزاں کی آمد کی نامہ بر ہیں
رگیں، کبھی یُوں تپش زدہ تھیں
کہ جیسے سیّال آگ
بے آب مچھلیوں کی طرح ہو بے کل

یہ ہاتھ اُٹھے نہیں دُعا کو
یہ ہاتھ، دستِ طلب کی صُورت
کہیں سُبک سر نہیں ہُوئے ہیں
یہ ہاتھ اپنی ہی آرزوؤں کے
قاتل و ناخُدا رہے ہیں

یہ ہاتھ کہ جن کی اُنگلیوں میں
مشقّتوں کے عذاب نے
ہر گرہ کو چپٹا بنا دیا ہے
ہر ایک ناخن، شکستہ ساحل کی شکل میں
بدنمائی کا آئینہ بنا ہے
یہ میرے اچھّے دِنوں کی تصویرِ ابتدا ہے

# نئی شرطیں

بدلنا جو چاہو
تو اپنے ہی ہاتھوں کی جُنبش کو بدلو
سمٹنا جو چاہو
تو اپنے گریباں کا خود چاک دیکھو
مچلنا جو چاہو
تو پھر لغزشوں سے مرصّع یہ رفتار بدلو
سنّورنا جو چاہو
تو خوابوں کی شہزادگی کے اُجڑنے پہ شُکرانہ بھیجو

حال کو اپنی تصویر سے یوں علیحدہ کر دو
کہ تمہیں اپنے پیروں کے نیچے
تمہارے ہی سائے کا نقطہ ملے

---

# اُفق بدلتا آسماں

پلک میں شب زاد جانگدازی
وہ حرف و صُورت کے رُوپ دھارے
کہ پتّھروں کو بھی موم کر دے
پلک میں صرصر کا ایک جھونکا
پلٹ دے آکے بساطِ کاکل،
کہ دل یہ چاہے
کوئی ذرا سخت اُنگلیوں سے
اِن اُلجھے بالوں کو پھر سنوّارے
پلک میں اِک تیرگی کا بادل
اُداسیوں کی سبھا سجائے

پلک میں وہ آئے اور جائے
پلک میں یوں روئے، مُسکرائے
کہ سات رنگوں کی چھایا بن کے
مجھے بس اِک پل کو چھَب دکھائے
مَیں سو رہوں تو مجھے جگائے
جو جاگتی ہوں، تو اِک پَل بھی نظر نہ آئے
پھٹی ہُوئی آنکھ میں
تو کسی جنوں کی ستیز کاری کی جھلکیاں ہیں

# تعبیر

وہی ہے شنگرفی رنگ سُرخیٔ غم کا
وہی ہے چاند کے چہرے پہ جانکنی کا حصار
وہی ہے زرد رو پتوں کے ٹوٹنے کا سفر
وہی دل میں تماشائے خستگی کی چُبھن
وہی ہے ٹھہر نہ سکنے کا زندگی کا چلن
وہی ہے فصل غمِ ناتمام کا عالم
وہی ہے صُبحوں کی تابندہ رنگتوں کی سبھا
وہی ہے جلتی دوپہروں میں عکسِ دل زدگی
وہی ہے قرمزی شاموں میں حدّتِ مثبت
وہی ہے ڈھلتی ہوئی رات اذنِ بے مایہ

وہی ہے قرب کی چاہت، سپردگی کی تڑپ
وہی فلک کی ہے رنگت وہی ہے راہگذر
مگر وہ شخص کہ جس کے لیے یہ سب کچھ تھا
وہ میرا نام درختوں پہ لکھ کے چھوڑ گیا

# اب پھرے بیکار ہیں

خزاں خوردگی سے
جواں سائے شب
پنہ مانگتی ہے

ہراساں ہے شب
کہ انوکھے سویرے
کہیں اس کی شفّاف تیرہ شبی کو ملوّث نہ کر دیں
کہیں کوئی دامن اُلجھ کے گریباں کی صُورت نہ بن جائے
کہیں ملگجی دُھند میں نو دمیدہ شگوفوں کو بھی
زندہ رہنے کا رستہ نہ مل جائے
کہیں، خواب، تعبیر سے آشنائی نہ کر لیں

یہ شب، جو زمانے سے ہم پر
سراسیمگی اور اندھیرے کا جادُو چلائے ہوئے ہے
یہ شب، جو ہمیں آس کی ڈوریوں سے تُڑا کر
نئے جال میں دلنشیں طور پر، قید کرتی رہی ہے
یہ شب، جو ہر اِک گھر کے دالان میں
مشعلوں کی زبانوں کی دشمن رہی ہے
یہ شب، جو کہ "کُل" اس زمیں کے جیالوں کی
آنکھوں کا پردہ رہی ہے، پناہ مانگتی ہے، ہراساں ہوئی ہے
یہ کیا راز ہے
کیا یہ شب کے بڑھاپے کا آغاز ہے؟

# کڑے کوس

حرف،

گویائی کی زنجیر میں جب قید ہُوا

اِسم بنا

عہد بنا

نظم بنا

قصّۂ کام و دہن کا غمِ مطلوب بنا

خوب و ناخوب بنا

حرفِ ناگفتہ

مگر ذہن کا آزار بنا

دل کی دیوار بنا

راہِ دشوار بنا۔

قصۂ شوق کی وارفتہ کہانی نہ بنا

حیلۂ وصل کی غم دیدہ نشانی نہ بنا۔

دار ہے منزلِ گویائی

سبھی جانتے ہیں

حرفِ ناگفتہ کے یہ زخم مگر میرے ہیں

جن کو تنہائی مری،

مجھ سے سوا، جانتی ہے

---

# سنیاس

دل نہیں مانگوں
دل جو گیا، پھر کس نے پایا
وعدہ نہ چاہوں
وعدہ، رات کے ساتھ ہی ڈوبا
ساتھ نہ چاہوں
ساتھ تو سائے کا بھی جھوٹا
حق نہ جتاؤں
چیز پرائی پر حق کس کا
بھول نہ پاؤں

ہر دُکھ ، جی کے روگ سے اچھّا۔
کب تک پُورے چاند کو پُوجوں
کب تک اپنے ہاتھ کو دیکھوں

# رسم

تمہیں دیکھ کے میری آنکھوں میں
حدّت کی تازہ شعاعیں جو پھُوٹیں
مرے ہونٹ تازہ شگوفے بنیں
تو تمہیں یوں لگے
کہ ہر اک آنے والے کا سواگت
کروں مَیں یونہی

تم کہو
کیا تغیّرُ ہر اک دَور کو موسمِ گُل بناتا ہے
[illegible] دھڑکتا ہے

کیا، ہر اِک آشنا
شکل سے آشنا
واقفِ دیدہ و دل بھی ہوتا ہے یوں
کہ اُسے دیکھ کے
جاگیں آنکھوں میں جدّت کی تازہ شعاعیں!

رسم ہے یہ کہ جس سے ملو
اُس کی چاہت خریدو
نفس در نفس اس کی سانسوں میں خوشبو کی صورت بسو
اس کو بے بس کرو، مُسکراؤ
تو پھر یوں کہو
مجھ سے پہلے تھے کتنے وہ خوش بخت
جن کی رگوں کے اندھیروں کو تم نے منوّر کیا۔

# آتشبازی

تم کو مجھ سے بے انداز ہے پیار اگر تو
میری تنہائی جھلسا دو
میرے گھر کی دیواروں پہ رقمِ حقارت
آ کے مٹا دو،
میری تنہائی ہے
میری آنکھ کی پتلی
اس کو حسنِ بصیرت بخشو
میری شامِ عروسی سجاؤ

شامِ عروسی!
جب تاروں کی جھلمل کا یا

مرد کے ہاتھ میں قبضۂ قدرت دے کے سُدھارے ،
جب عورت کی زباں پہ
لاج کے صد آشوب ٹھہر کے سوانگ رچائیں
پُھلجھڑیوں کی بارش جاگے
آتش بازی رنگ جمائے
ساری عمر کی آتشبازی . . .

# چوں بروں آمدم از چاہ بہ زنداں رفتم

مَیں حد سے بڑھ جاؤں تو
پھر تم ہی کہو گے
باؤلی ہو ، یوں دُنیا سَو سَو نام رکھے گی
کِس سے مِلو گی ، کِس سے کہو گی
مَیں تو ہار گئی تھی خود سے
کاہش سے بے حال ہوئی تھی

کیا ان گھڑیوں کا گزرنا
یادوں کے نایاب گہُر

اندھی سیاہی
گھور اماوسں
اُور بھلا کیا بن کے رہے گا۔
دروازہ جو اندھی آندھی کھول گئی ہے
بند اُسے اب کون کرے گا
مَیں تو تنکے کی صُورت، لرزیدہ ہُوں
دہشت کی کونپل، اب جھاڑی بن کے
میری چوکھٹ پر اُگ آئی ہے

# سَراب

ہو آئینے کی طرح، جن کی اصلیت کا فریب
انہیں کھُرچ کے بھی دیکھو تو کیا ملے گا بھلا
بس اب تو سُرخیٔ رخسار بھی فریبِ محض
لبوں پہ کھِلتی ہنسی بھی فریب
غم بھی فریب!
دِلوں کی بات بھی جھُوٹی، فسونِ چشم فریب
ہر ایک ساعتِ دیدار وہم، وعدہ فریب
ہر ایک مژدۂ دشوار ہیچ، دعوئے فریب
سکوتِ شب کا فسوں بھی فریب، صبح فریب

رواں ہے یوں کہ سفیدی سیاہیوں سے الگ
دکھائی دے تو فریبِ نظر لگے وہ بھی
مگر وہ سُرخیِ شفق کی سیاہ بادل پہ
فریبِ لمحہ ہے لیکن حسین لگتی ہے،
یہ زندگی تو یونہی پینترے بدلتی ہے

---

# رُوح کا بوجھ

ابِ حسِ وفا، آئینۂ شوق سے بیزار
تدبیرِ رہِ ہست کی یک رنگئ آہنگ سے
پتھرائی ہوئی آنکھ کی صورت ہے
سزاوارِ شبِ تار۔

اِک سائے کی صُورت ہے ہر اِک شکل کا احساس،
آنکھیں نظر آئیں
تو خدوخال کا نقشہ نہیں جمتا
اب خود کو بھی خود سے ہی
چھپائے نہیں بنتا

اب زیست ہے صحرا کے سرابوں کی طرح
رونقِ احساس،
جینے کی ہوس، مشکِ رفاقت سے ہے عاری
اب رشتۂ دل، لطف و عنایت سے ہے عاری
تمہیدِ ستم اب تو مداوا نہیں غم کا
کچھ کشف تمہیں ہو تو بتاؤ کہ یہ کیا ہے!

---

# تمہید

ابھی تو نغمہ لبوں پہ آنے کے
سُر کی ہر جستجو میں گُم ہے
ابھی تو خواہش نے سر اُٹھا کے
نمو کے پھیلے ہوئے سمندر کو
آزمانے کا دَم بھرا ہے
ابھی تو آنکھوں نے دیکھنے کی طلب کا کاسہ
اُٹھا لیا ہے
ابھی تو لرزش ہے انگلیوں میں
ابھی قدم منجمد ہیں یا پھر فسوں زدہ ہیں

ابھی مسافت کی راہ آساں نہیں ہوئی ہے
ابھی ترے جاگنے کے دن ہیں
ابھی مرے جاگنے کے دن ہیں

# خُود اذیّتی

کاش کوئی جھونکا ایسا ہو
میری شکل کی رونق لے کر
مَیلے، گدلے، اندھے کنوئیں میں پھینک دے جاکے،
کاش مری آنکھوں کے تارے
یُوں اُلجھیں یہ رات کی تاریکی بھی
ان کے نام سے بھاگے
کاش مرے لہراتے بازو
خوف سے یوں جامد ہو جائیں
جیسے ٹھہرا کُندن چمکے
کاش مرے ہونٹوں کی لالی

کالی رات کی دیوی ڈس لے
کاش مری سوچوں کے دھارے
ریت کی صُورت
چُوس لیں خود اپنی ہی گرمی
کاش مری آنکھوں میں خواب، نہ پھیلیں آکر
کاش مجھے احساس کی تصویروں سے
بیزاری ہو ایسی
اپنی نفی پہ ناز مجھے ہو

# سلاسل

رشتۂ جاں ہے
فقط سانس کی زنجیر کا نام
رشتۂ دل ہے
فقط آنکھ کی تحریر کا نام
رشتۂ خوں ہے
فقط اپنی ہی تصویر کا نام
رشتۂ غم ہے
فقط حلقۂ دلگیر کا نام

یہ اُمڈتی ہُوئی موجوں سے
لپٹتا ہُوا کف

یہ ہواؤں سے گلے ملتے ہوئے
خاک کے ذرّے
یہ ہر اک راہ پہ
شاخوں سے الگ ہو کے
سراسیمہ بکھرتے پتّے
جبر کی سل پہ
کچلتے جذبے
یہ مری خواہشِ نایافت کی
تحریریں ہیں
یہ ترے جذبۂ اُمید کی
زنجیریں ہیں

---

# جانتے بُوجھتے

پا برہنہ، سر اُدھام کھڑی ہوں تنہا
مُدّعا، شوق کی تفسیر نہیں، غم بھی نہیں
دِل کی بربادی کا ماتم بھی نہیں
جانکنی، دیدۂ پُرنم بھی نہیں

پھر بھی ژولیدہ تسلط ہے
شکیبائی کا
پھر بھی بے رنگ ہیولے ہے
شناسائی کا

پھر بھی رنگت گلِ شب رنگ سی ہے
وہم کی غایتِ موہوم
رگِ سنگ سی ہے !

# بات کا درد

پربتو !
بن کہی بات کس سے کہو گے
ہواؤں سے
جو اُلجھے اُلجھے خیالوں کے تیزاب سے بچ نکلنے کی خاطر
زمانے کے ہر دُکھ سے دامن بچا کر
خلاؤں سے اپنے تعلّق پہ نازاں ہُوئیں
کہ اُس پا شکستہ اُڑتی ہوئی ، گردشوں میں مقیّد
ہر اِک لہر سے ، جو پلٹ کے بھی فریاد کر نہ سکے

جو اگر چیخ کر، گردشوں سے بغاوت کرے
تو بھی گرداب کی گود میں ہانپتی خواہشوں کے جنازے کو تکتی رہے

بن کہی بات بھی، رینگتی جانکنی کے کچوکوں سے کم تو نہیں
یہ سُلگتا ہُوا زہر، جسموں کو ویرانیوں کے کنارے پہ لا کر
ہر اک کشتیٔ آرزو کو جلا دے
یہ اُمڈے ہوئے سیل کو خُشک صحرا بنا دے

پر بتو!
تم خیالوں کی انگڑائیاں ہو
تمہیں کیا کہ اِس سمت، گھاٹی کی جانب
جوانی، نئے سال کے آخری دن کی صُورت
مضطرب تلخیوں کی فراموش گاہیں سجاتی رہی ہے
بن کہی بات کا درد دِل میں چھپاتی رہی ہے

# پیش بندی

پھر نظر آئی ہے
جینے کی وہ صورت، کہ ہے جس میں شامل
دِل کی دریوزہ گری
ذہن کی آشفتہ سری
غم کو بہلانے کی سعیٔ ناکام
اس سے دُوری میں بھی قُربت کی تپش
اور پھر قُرب میں حائل وہی دُوری
کہ نہیں جس سے مفر۔

جسم کا اندھا کنوّاں
یاد کی گیلی مٹّی

یہی دولت، یہی عُسرت
یہی نیکی تو یہی رُسوائی
تشنہ کامی کے سمندر میں چھپالو خود کو
اس کو دیکھو گی تو پھر اس کی طلب
چین نہ لینے دے گی۔

# خواب میں خواب کا ڈر

کِس نے کہا تھا اُن سے مِلو
بات بھی کرو۔
اینٹوں کا رنگ سُرخ ہے،
دیوار بھی ہے سخت
دیوار پر جڑی ہُوئی شیشے کی ٹُکڑیاں
نازک ہتھیلیوں کو کریں گی لہو لہان
آنگن میں اُس کے جھانکنے دیں گی نہ رات کو،
اب تو ہَوا کے ساتھ بھی باتیں کرو گی تم
دن میں تو دفتروں کے مشاغل بہت سے ہیں
راتوں کو دِل کا چور نہ سوئے نہ سونے دے

# ناگزیر

جب جلے تازہ شگوفوں کا جمال
جب نگاہوں سے جھلک اُٹھّے دِلوں کی حالت
جب قدم بھی کششِ منزلِ جاناں کھو دیں۔
دلِ وحشی کبھی ادراک کی اُنگلی پکڑے
راستہ ڈھونڈنے نکلے تو تماشا بن جائے۔
زیبِ امکاں سے گریزاں ہو ہر اک خوابِ وفا
جب تمنّا صدفِ غم میں ہی محصُور رہے
جب مقدّر شبِ دیجور رہے
جب کہ دیوانے نہ اُلجھیں کبھی زنجیروں سے،
شہر، طوفان کی زد میں ہو گا!

# خود کلامی

عجیب آنکھیں ہیں
دن کو ہنستی تو رات کو خواب میں برستی ہیں، جیسے یکدم
بھرا کٹورا کوئی اُلٹ دے

عجیب زباں ہے
چلے کترنی سے تیز ایسے
جیسے دریا میں لہریں اُٹھیں،
مگر جو کوئی ستم پڑے تو
زباں تو کیا آنکھ سے بھی اظہار ہو نہ پائے۔

عجیب دل ہے

کہ ہر دُکھی دل کی داستاں سننے بیٹھ جائے
نہیں ہے معلوم ہر دُکھی دل کی یہ کہانی
تو گفتگو کے لیے ہے زینہ،
نہیں یہ معلُوم
ہر کوئی تو اسی طرح سے قدم قدم پر نثار ہوتا ہے
ہر ادا پر۔

انا کی قندیل گُل کرو بھی
یہ دُہری صُورت کے رنگ یک جان کر بھی ڈالو
بدل بھی ڈالو لباسِ عادت،
یہ ادّعائے وفا نما کِس لیے ہے آخر!!

---

# کنوارپنے کی سوچ

جواں لڑکیاں ٹین کی چھت کے اُوپر کھڑی
سوچتی ہیں
یہ گرمی جو پاؤں کو لپٹی ہوئی ہے
اگر سخت ٹھٹھرے ہوئے جسم میں پھیل جائے
تو ہلکی گلابی نسوں کو
دہکتے ہوئے سُرخ شعلوں کی بھٹی بنا دے
ہر اِک نبض کو نبضِ طوفاں بنا دے
ہر اِک سانس کو شعلہ ساماں بنا دے
ہر اِک خواب کو رشتۂ جاں بنا دے
مگر پھر یہ طوفاں زدہ زندگی

کیا یونہی پھر جلتی ہوئی دُھوپ میں
ٹین کی چھت کے اُوپر کھڑے
آتے جاتے مسافر کے سائے کو تکتی رہے گی !

# پہلا سفید بال

وحشت آمیز خیالوں کی لکیریں جاگیں
شعلۂ خواہشِ نایافت بھڑک کر چمکا
سائے لمبے ہوئے سب بیتے ہوئے برسوں کے
ذہن نے عمرِ گریزاں سے تعلّق باندھا

آئینہ ، ہوش کی مقراض بنا
پیش گوئی کے ہیولوں کے حوالے کر کے
کر گیا سینۂ سوزاں کی تپش کو ارژنگ
آتشیں زہر سا رگ رگ میں مری چھوڑ گیا
بے کراں شوق کی موجوں کا فسوں توڑ گیا

کالے بالوں میں وہ مرمر کی چمک

یخ سفیدی کے تناؤ میں نہاں
ڈھیلی پڑتی ہوئی گزرے ہوئے برسوں کی گرفت
مجھ کو اندیشوں کی دہلیز پہ لے آئی ہے
آئینہ، شوق کی تقصیر بنا!

# نروان

تم وہی خواب ہو
جو جاگتی آنکھوں کو نظر آتے ہیں
تم وہی نقش ہو
جو زیست کی بنیاد ہی بن جاتے ہیں
تم وہ آواز ہو
جو کافر و دجّال سے لبیک کہلواتی ہے
تم وہ تصویر ہو
جو اصل سے بڑھ کر دلکش
خواب سے بڑھ کر رنگیں

تم وہی روشنی ہو
جو کہ پرے سات فلک میں کہیں تابندہ ہے
تم وہ ہم مسلک و ہمزاد کہ میں
آئینہ دیکھوں تو تم کو ہی نمایاں دیکھوں

# عرُوسی

مَیں نے تنہا، سینکڑوں راتیں گزُاریں
جاگ کر یہ سوچتے
کِس طرح ہو گی بھلا
اُس وصل کی شب کی سحَر
جس شب کہ آنکھوں کی چُبھن
نیند کی خوشبو کی بانہوں سے لپٹ کر سو رہے۔

مَیں نے بچپن ہی سے پُوجا تھا
دُلہن کا عکس و رنگ۔
جامنی رُخسار کی رنگت

مہک، اُبٹن کا لمس
شعلہ رُو، شعلہ نفس
سہمی، سمٹائی سی
گٹھڑی کی طرح بیٹھی ہوئی

مَیں نے بچپن ہی سے چاہا تھا
دُلہن بن جاؤں مَیں!
چمپئی رنگت کو گہرے شعلہ رُو کپڑوں میں ایسے ڈھانپ لوں
میرا چہرہ، میری سکھیاں ڈھونڈنے بیٹھیں
تو تھک کر ہنس پڑیں
مجھ کو گٹھڑی کی طرح دیکھیں
تو ڈھولک تھام لیں

مَیں دُلہن ایسی بنی لیکن
کہ مہندی تھی نہ افشاں
اور نہ اُبٹن کا خُمار
آنکھ میں کاجل کی تحریریں بھی

اپنوں سے جُدائی کے غموں میں ڈھل گئیں
رہ گئی اس قُرب کی خوشبو کہ جس کے نام پر
خون کے رشتوں کو بھی
مَیں زندگی سمجھی نہیں
اور پھر خوشبو سے رشتہ تابکے!
خواب کی مانند جینا تابکے!

---

# اپنے خُون کا جوش

ابر اور اندھی ہواؤں کے سفینے تھے رواں
رات جب خلوتِ احساس سجانے نکلی
میری راہوں میں تری آس کھڑی تھی ایسے
جیسے کر دے گی فنا، فرق و دوئی کی صُورت۔

مَیں کہ تھی تِشنہ و تنہا، بے کل
دِل تھا اندیشوں کی دہلیز پہ غلطاں، پیچاں
ہاں مگر حلقہ بگوشی کی تمنّا دِل کو
کھینچے جاتی تھی کسی کُنج ملاقات کی سمت
خواہش و شوق کی وارفتہ مدارات کی سمت۔

مَیں نے چاہا تھا وہی

تُو نے بھی چاہا تھا وہی
فرق پھر کیا تھا کہ رہتی قائم
دل کی دریوزہ گری
روح کی آشفتہ سری
دل میں تسخیرِ تمنّا کی خلش ۔
بات سے بات چلی
رات سے رات چلی
دن گزرتے گئے ، ہفتوں کی طرح
اور مہینوں کی طرح
غم مقیّد ، دلِ وحشی نے رہائی پائی ۔

آج تک وقت کو زنجیر کیا ہے کس نے
کِس کے ہاتھوں میں عنانِ شبِ مدہوش رہی
کون جیتا ہے فقط ایک خوشی کی خاطر
ڈر ہی جاتے ہیں زمانے سے زمانے والے
ڈھونڈ ہی لیتے ہیں تطہیرِ وفا کی صُورت

اپنے ہی خون سے مژگاں کو سجا لیتے ہیں
دل میں اُمڈی ہوئی اُلفت کو سُلا دیتے ہیں ۔

میں کہ عورت ہوں
مرے نام سے غیرت منسوب
مُجھ سے گھر بار کی عزت
مری خواہش مٹّی
مری چاہت حیلہ
مرے خوابوں کی پناہ گاہ
فقط خاک ہی خاک

خاک پھر خاک ہے
اک ذرا اُڑ کے ، وہیں بیٹھ رہے گی پھر سے
پھر اُجاے گی وہی فرق و دوئی کی صورت
پھر تمنا کے سرابوں سے بہلنے کے لیے
کیا مٹا دے گی وہ صورت کہ تھی جس میں شامل
تری چاہت ، تری رنگت ، مرے سینے کی تڑپ

دِل مگر بھُول سکے گا نہ وہ موہوم نقوش
پاک شبنم سا، لچکتا ہُوا، ریشم کا بدن
اس کی بے داغ جبیں پہ مرے اعمال کی دُھول
اس کی آنکھوں سے جھلکتے ہوئے لاکھوں شکوے

"دامنِ اُلفتِ مادر تری غیرت کیا ہوئی
تری چاہت کیا ہُوئی
کیوں ترے نام سے منسوب ہُوئی رُسوائی
تُو تو تھی شمع، مَیں سایہ تھا ترا
اپنے سائے سے الگ ہو کے بھی رہتا ہے کوئی
اپنی تکمیل بھلا اِس طرح کرتا ہے کوئی..

ہاں مگر مُجھ کو فقط چاہنے والے کا سہارا تھا عزیز
اس سہارے کو نبھانے کے لیے
خود کو آسودہ بنانے کے لیے
اپنی شفقت کو مٹایا
تجھے تنہا چھوڑا
اپنے میکے کو بھی چھوڑا مَیں نے

اپنی سکھیوں سے بھی ناطہ توڑا
اور جھولی میں لیے مُشتِ وفا
بانہہ پھیلا کے سہارا مانگا
اس کی چاہت کا دلاسہ مانگا
ہاتھ پھیلے ہی رہے اور سہارا نہ ملا
جس کے کہنے پہ بساطِ زرِ مادر ہاری
وہی پیارا نہ ملا

# آخری وار

کو پاکیزگی کا جوبن کہا کسی نے
ود فریبی کے خول میں
ے سمٹ گئی وہ
پھول بن کر، بکھر گئی وہ

# بے نام مُسافت

اس سے بہتر تو یہ تھا
مُجھ کو، مری تیرہ شبوں کو
صفِ ناموس کے عنوان سے
پھیلی ہوئی تنہائی دشوار کو
کانٹوں سے اُلجھتے ہُوئے
بس دیکھتے
لفظوں کی پھواروں میں بہا دیتے
بُجھا دیتے
وہ تسلیمِ خود افروز کی شمعیں
کہ جنھیں دیکھ کے آنکھوں میں حیا گُھل کے

کبھی شرم کے ڈورے
تو کبھی حجلۂ احساس
کبھی سانس، کبھی پھانس
کبھی قوس، کبھی آس
بنا کرتی تھی

چلن کے نام پہ پلتی ہوئی بے چینیاں
ہر روز، ہر اک شب
غمِ موہوم کی صورت میں
ہنسی اور تفکّر کے تموّج میں
گھُلے اشکوں کو پی لیتی ہیں

تم نے کیوں کشفِ مسیحائی کے جلووں سے
مجھے کوئے رفاقت کا پتہ بتلایا
راہ بتلا کے بچھڑنے والے
کیا تعلق اِسی دشوارئ موہوم کی رسّی ہے
جو بَن جائے کبھی طوق

کبھی رشتۂ زیست ،

بوند کی شکل میں خوں ٹپکے تو گھاؤ نہ کھُلے

کیسے سمجھاؤں کہ اب عکس بھی پہچان کی صُورت نہ رہی

# یوسف کامران

وُہ تو مُجرم تھا محبّت کا
مَیں اُسے جانتی تھی
مَیں تو اُس شخص کے ہر نقص کو پہچانتی تھی
میں اُسے چاہتی تھی۔

وہ شفق رنگ، حیا جس کو کہیں
تھی یہی میری وفا کی تعبیر
وہ بہانہ جسے چشمک سمجھیں
تھی مرے تیرے تعلق کی نظیر۔

تُو کہ محبُوب مجھے تھا، مجھے معلوم ہے یہ

تُو کہ مجرم تھا، مرے پیار
مری چاہت کا
تُو کہ دیوانۂ مخفی محبت تھا سدا
تجھ کو کیا سوجھی
کہ قدموں کے نشاں اُلجھا کر
چہرۂ زرد لیے
میری ہتھیلی پہ لگی مہندی کو دُھندلانے لگا
جیل کی گرم سلاخوں سے
مرے بچوں کو تڑپانے لگا
تُو کہ مجرم تھا محبت کا
زمانے کو خبر کیسے ہوئی!!

---

# نظمیں

دیس بدیس کی نظموں کے نثری تراجم

# ترتیب

مَیں تمھارے ساتھ وہی کرنا چاہتا ہوں
جو چیری کے درختوں کے ساتھ موسمِ بہار نے کیا تھا۔

(پابلو نیرودا)

# پابلونیرودا

پابلونیرودا ۱۲ جولائی ۱۹۰۴ء کو چلی کے ایک قصبے
پرال میں پیدا ہُوا۔ اُسے بچپن میں ہی نظمیں لکھنے کا شوق تھا۔ اس کا
باپ جو ریلوے لائن پر مزدوری کرتا تھا، اسے شاعروں سے نفرت تھی
باپ کے خوف سے ۱۵ سال کی عمر میں پابلونیرودا نے جس کا اصلی نام
ریکاردو الیذر نفتالی ریس اِی باسوالتو تھا، پابلونیرودا کا قلمی نام اپنالیا
۱۹۲۳ء میں اس کا پہلا مجموعۂ کلام "جھٹ پٹے" کے نام سے شائع ہُوا۔
ایک سال بعد دوسرا مجموعہ "بیس محبت کی نظمیں اور ایک یاس کا گیت" چھپا۔
یہ مجموعہ نیرودا کی فوری شہرت اور مقبولیت کا باعث ہُوا۔ ۱۹۲۷ء کے بعد
سے وہ مختلف ممالک میں اپنے مُلک کے سفارت خانوں میں قونصل کے
عہدے پر کام کرتا رہا۔ سپین کی خانہ جنگی کے دوران وہ میڈرڈ میں اپنے
مُلک کے قونصل کی حیثیت میں کام کر رہا تھا۔ اس زمانے میں اس
نے انقلابیوں کے حق میں جو نظمیں لکھیں وہ اس کی عالمی شہرت کا باعث
بنیں۔ ۱۹۴۳ء میں وہ چلی کی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوگیا۔
۱۹۴۵ء میں وہ سینٹ کا ممبر منتخب ہُوا۔ ۱۹۴۸ء میں چلی کے صدر
کی امریکہ نواز پالیسیوں کی مخالفت کی بنا پر اسے جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔

جلا وطنی کے دوران اس نے اپنی عظیم نظم "کانتو جنرال" لکھی۔
اس نظم میں والٹ وٹمین کا اثر نمایاں ہے۔
۱۹۵۳ء میں اسے ستالن امن انعام دیا گیا۔
۱۹۷۱ء میں جبکہ وہ چلی کی مارکسی حکومت کی طرف سے فرانس میں سفیر تھا، اُسے ادب کا نوبل پرائز ملا۔
دو سال بعد ستمبر ۱۹۷۳ء میں جب فوج نے چلی کی مارکسی حکومت کا تختہ اُلٹا تو پابلو نیرودا بیماری کی حالت میں چھٹی پر چلی آیا ہوا تھا۔ اُسے اس انقلاب سے سخت صدمہ پہنچا تھا اور وہ نہایت کسمپرسی کی حالت میں چند ہی دنوں میں انتقال کر گیا۔

# بلّی کا خواب

کیسی خوش سلیقگی سے بلّی سوتی ہے
وہ اپنے پنجوں اور اپنے بھرپور وجود کے ساتھ محوِ خواب ہے
وہ اپنے چالاک پنجوں ، بے رحم خون اور جسم پر پھیلے بُوٹے
دائروں کے ساتھ محوِ خواب ہے
محوِ خواب ہے اس ریگ رنگ دُم کے ساتھ
جس پر جلے ہوئے دائروں کے نقوش سربسر ہیں
چقماق نما کھُردری زبان
اور آگ کی طرح سوکھی ہوئی جنس کے ساتھ ۔
مَیں بھی بلّی کی طرح عصر کی سنجاب اوڑھ کر
سونا چاہتا ہوں

اور پھر کسی سے ہم کلام ہوئے بغیر
اپنے وجود کو دُنیا کی وسعتوں
پہ نشیبوں، وادیوں پہ پھیلا کر
خوابوں میں چوہوں کا شکار کرنے کی
بے پناہ خواہش کو زندگی دینے کا آرزومند ہوں۔
میں نے دیکھا ہے
سوتے میں بِلّی کیسے کیسے رُوپ دھارتی ہے
کیسے رات سیہ آب کی طرح اس کے وجود میں سرایت کر جاتی ہے
یہ کبھی سنسان اور چٹیل برف کے انبار پہ گرنے لگتی ہے
تو کبھی اِس انبار کی تہ میں اتر جانا چاہتی ہے
یہ کبھی نیند میں اتنی بڑی ہو جاتی ہے
کہ چیتے کی بھی پڑدادا معلوم ہوتی ہے
اور سیاہیوں کی یورش میں بھی، یہ آتش فشاں پہاڑوں
بادلوں اور چھتوں کے اوپر چھلانگیں لگاتی پھرتی ہے

رات کی بلّی ــ سوؤ ــ ابھی اور سوؤ
اسقفی آداب اور پتّھر کی طرح ترشی ہُوئی مونچھوں کے ساتھ

اپنے سارے خوابوں کی حفاظت کرو
اپنے بے درد دل اور سخت کھُردری دُم کے ساتھ
ہماری خواب آلود بہادری کے ابہام پر قابو پاؤ

# ایک بچّے کا غسل

اس زمین پر قدیم ترین محبت بچّوں کے مجسّموں کو نہلا کر کنگھی کرے گی
وہ ان کے پیروں اور گھٹنوں کو سیدھا کرے گی
پانی چڑھتا ہے، صابن پھسلتا ہے،
اور پاک جسم بلبلوں اور مامتا کی ہواؤں میں
سانس لینے کے لیے اُوپر آتا ہے
اوہ! کس قدر شدید نگہداری
خوبصورت فریبِ نظر
اور بے جان جدّوجہد!

اب بال ایک اُلجھی ہُوئی بوچھاڑ کی طرح ہیں
جس پر کوئلے، برادے، کلونس اور برقی تاروں نے

آڑی ترچھی لکیریں ڈال رکھی ہیں
یہ اس وقت تک اُلجھے رہیں گے
جب تک کہ محبّت اپنے تحمّل کے ساتھ
بالٹیوں، سفنج، تولیوں اور کنگھوں
کو بروئے کار لائے۔
یوں دھونے اور سنوارنے سے
اور بنیادی احتیاط کے نتیجے میں
سفید یاسمین کی طرح
بچّہ نمودار ہوتا ہے، اور بھی تازہ،
مگر پھر بھی وہ کب آرام سے بیٹھے گا
ماں کے بازوؤں کی زنجیر توڑ کر
اپنے جنوں اور شوق کے طوفان میں
وہ پھر کیچڑ، تیل، پیشاب اور روشنائی
کی تلاش میں نکل جائے گا،
خود کو چوٹ لگاتا اور پتھروں پر لڑھکتا پھرے گا۔
یوں، دُھلا دُھلایا، بچّہ زندگی میں شامل ہوتا ہے،

یعنی زندگی کی اگلی منزلوں میں اس کے
پاس سوائے صاف رہنے کے اور کسی
چیز کے لیے وقت نہ ہوگا،
مگر اس وقت صاف رہنے کے باوجود
زندگی مفقود ہوگی ۔

# جل پری اور شرابیوں کی حکایت

یہ سب لوگ اندر موجود تھے
جب وہ بالکل برہنہ اندر داخل ہوئی
وہ پی رہے تھے
انھوں نے اس پر تھوکنا شروع کر دیا
وہ دریا سے ابھی ابھی آئی تھی
اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا
وہ ایسی جل پری تھی جو اپنا راستہ بھول چکی تھی
طعنے اس کے چمکدار بدن پر سے پھسل رہے تھے
اُس کی سُنہری چھاتیاں. فحش گوئی سے تربتر تھیں
وہ آنسوؤں سے ناآشنا تھی

وہ بالکل نہیں روئی
وہ کپڑوں سے ناآشنا تھی
اُس نے کچھ نہیں پہنا تھا
انھوں نے اسے جلے سگریٹوں اور بوتلوں کی
ڈاٹوں سے چھلنی کیا
اور فرش پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے
وہ بالکل کچھ نہیں بولی
کہ لفظ اس کے لیے اجنبی تھے
اُس کی آنکھیں گزری ہوئی محبتوں کے رنگ جیسی تھیں
اور اس کے بال زردی مائل ارژنگ تھے
سُرخ چمکتی روشنی میں اس کے ہونٹ
بے صدا ہلے اور آخر کار
وہ اس دروازے سے چلی گئی
اگر وہ بچتی بچاتی دریا میں گھس گئی ہو
تو وہ پاگل ہو گئی ہو گی
ایک دفعہ پھر بارش میں دھلے سفید پتھر کی طرح

اور پیچھے دیکھے بغیر۔ وہ ایک مرتبہ پھر
تیَرتی رہی
وہ اپنے وجُود کے آخری سانس تک تیَرتی رہی
وہ عدم آباد میں داخل ہو گئی

# خزاں زدہ وصیّت

شاعر اپنی حالت، در ترجیحات کے بیان سے آغاز کرتا ہے۔

موت اور بے حسی کے عالم میں
میں نے گٹار اُٹھایا
اور اس محویت کے عالم میں
میرا دل بھی نہیں دھڑکا
کیونکہ جہاں میرے لیے ذرا سا بھی انتظار نہ ہو
وہاں مَیں اپنے اثاثے کے ساتھ
خزاں کے پہلو میں
اپنا پہلا جام لینے کو آگے بڑھتا ہُوں

اگر وہ دروازہ بند کریں
مَیں اندر چلا جاؤں گا

اگر وہ مجھے خوش آمدید کہیں
تو مَیں بھاگ جاؤں گا ۔
مَیں ان ملّاحوں میں سے نہیں ہوں
جو برف پر ہاتھ پیر مارتے پھرتے ہیں
مَیں ہَوا کی طرح
انتہائی زرد پتّیوں اور موتیوں ںآنکھوں میں
مِٹتی ہوئی تہذیبوں کے ساتھ چلنے کا عادی ہوں
اگر مَیں کہیں آرام کرنے کی ٹھانوں تو
پھر آگ کے سینے میں
ان چیختے ہُوئے کوئلوں میں آرام کرتا ہوں
. اپنے اندر ہی اندر بھسم ہو کر رہ جاتے ہیں

تم نے اپنا نام کونوں پر لکھا دیکھا ہو گا
مَیں اس کے لیے معذرت خواہ نہیں ہوں
اس کا کسی چیز سے بھی واسطہ نہیں ہے
مگر ہر چیز سے واسطہ ہے
کیونکہ تم میرے لیے وجود بھی رکھتی ہو اور نہیں بھی

ہر ایک کے ساتھ یونہی ہوتا ہے۔
مگر کوئی اس حقیقت کو نہیں پہچانتا
اور جب وہ اعداد کو جمع کرتے ہیں
تو ہم متموّل نہیں ہوتے ہیں
ہم تو نئے فقیر اور غریب کی شکل میں اُبھر آتے ہیں

مجھے چوہوں نے کتر کتر کر ریزہ ریزہ کر دیا ہے
یہ بھی میرے لیے ان کی طرف سے بڑا اعزاز ہے
سمندر میں اکثر
گہرے سُرمئی رنگ کے گھونگھے
عجیب قسم کے زرد کیڑے
کھا کر گزر کرتا رہا ہوں
اور طوفانوں نے شہر کے شہر
میری قمیص اور میرے حفاظتی پیرہن میں کھو دیے ہیں
یہ وہ راستے تھے کہ جہاں اگر تم ہوتے
تو ہنستے ہنستے ہی مر جاتے اور وہ راستے تمھیں
فنا کر دیتے۔

وہ اپنے دشمنوں کا تذکرہ کرتا ہے اور اسی وقت میں اُن کو ترغیب کرتا ہے۔

پس مَیں ان سب کو چھوڑ کر جا رہا ہوں
جنھوں نے مجھ پر ناک بھوں چڑھائی تھی۔
سیّاح کی سی میری پلکیں
نمک کے لیے میرا شوق
میری مسکراہٹ کا رُوپ
ان سب جذبوں کو اگر ممکن ہو تو بے کنار رواں رہنے دو
چونکہ وہ مجھے نہیں مار سکے
اِس لیے مَیں انھیں اپنے کپڑوں میں ملبوس ہونے سے
نہیں روک سکتا ہوں
یا پھر اتوار کو ناقابلِ یقین بہروپ میں سامنے آنے سے
نہیں روک سکتا ہوں۔
مَیں نے کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔
تو وہ بھی مجھے چین نہیں لینے دیں گے
یہ تو واضح ہے مگر اس کی پرواہ نہیں
وہ مجھ سے کھائے ہُوئے زخموں کو بھی شائع کریں گے۔

وہ دوسری اشیا کی جانب
مائل ہوتا ہے۔

میں نے اپنی پارٹی اور اپنے لوگوں کے لیے
دُنیاوی چیزیں چھوڑ دی ہیں
ہم اب یہاں دوسرے مسائل کے لیے محوِ گفتگو ہیں
یہ مسائل واضح بھی ہیں اور مبہم بھی
یہ سب ایک ہی ماں کے جائے ہیں
یہی حال انگوروں کا ہے۔
دو انگور کے دانے ــ یعنی
سُرخ رنگ، سفید رنگ
زندگی کا تمام حُسن یہی سُرخ و سفید ہیں
جو واضح ہے وہ بھی مبہم ہے
ہر چیز زمین اور مٹّی نہیں ہے
سائے اور خواب، میری وراثت ہیں

وُہ جواب دیتا ہے اچھے
مقاصد والے لوگوں کو۔

ایک دفعہ اُنھوں نے مجھ سے پُوچھا
میری تحریر میں اس قدر ابہام کیوں تھا
وہ رات سے، جمادات اور درختوں سے بھی ایسا ہی
سوال کر سکتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں اس کا کیا جواب دوں
تب کچھ عرصہ بعد
دو دیوانے آدمیوں نے مجھ پر حملہ کیا
یہ کہتے ہوئے کہ مَیں سادہ لوح تھا۔
جواب تو بہتے پانی میں ہے
مَیں یہ کہہ کر بھاگتا ہُوا، گاتا ہُوا، چلا گیا۔

وہ اپنی تکالیف کو بیان کرتا ہے۔

کیا دُنیا میں کسی کو بھی اتنی خوشیاں ملی ہیں
جتنی مجھے
(خُوشیاں میری رگوں میں سمائی ہُوئی ہیں)
اور یہ سُود و زیاں میری فطرت ہے
مَیں ایک بہت بڑا بہتا دریا تھا
جس میں سخت پتھّر جلترنگ بجاتے، رات کے گہرے
سنّاٹے کو جگاتے
اور دن میں پھیلے اجیالے کو سمیٹتے لڑھکتے رہتے تھے
مَیں کس کو اس قدر زیادہ چھوڑ سکتا ہوں

اتنا زیادہ اور اتنا کم
کسی شے سے زیادہ اُس کے حصول کی خوشی
ایک تنہا گھوڑا، سمندر کے کنارے
ایک تکلہ، جو ہُوا کو بُننے کا خواہاں ہو۔

اور خوشیاں بانٹ دیتا ہے۔

مَیں اپنے غم ان کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں
جنھوں نے مجھے غم زدہ کیا
لیکن اب میں اُن کو بھی بھُول چکا ہوں
اور اب مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مَیں نے انھیں کہاں کھویا۔
اگر مَیں انھیں جنگل کے درمیان دیکھوں
وہ چڑھتی ہُوئی انگور کی بیل کی طرح ہیں جو اپنی پتّیوں کے
ساتھ اوپر کو اُبھریں گے
اور وہاں جا کے ختم ہوں گے، جہاں تم ختم ہو گے۔
تمھارے سر یا ہوا میں
اگر وہ دوبارہ نہیں اُبھریں گے
تو تمھیں دوسری بہار کے رُوپ میں آنا ہوگا

وہ نفرت کے خلاف اپنا موقف بیان کرتا ہے۔

میری نمود ، نفرت سے ہوئی ہے
دہشت ، بربریت اور اندرونی خلفشار سے ہُوئی ہے
نفرت پانی میں نظر نہ آنے والی کٹار مچھلی کی طرح ہے
جو کبھی کبھی اپنے خُون آلود گلپھڑے دکھاتی ہے
اور جس کے نیچے۔ تاہُوا صاف پانی، تمھیں گمراہ کرتا ہے۔

کیوں ۔ آخر کیوں ہم اتنی نفرتیں کرتے ہیں
ان سے جو ہم سے نفرت کرتے ہیں ۔
پانی کے نیچے ۔ شکار کرنے والے شکار کے منتظر، دم سادھے
پڑے ہیں ۔
ان کی تلواریں اور ان کے تیل کے کنستر، سب تیار ہیں
مکڑی جالے اور چُوہوں کے جال ، سب تیار ہیں
اس کا تعلق عیسائی ہونے سے بالکل نہیں ہے ۔
یا کسی عبادت یا خیاطی سے بالکل نہیں ہے
یہ تو صرف اتنا قصہ ہے کہ نفرت، کھیل ہار جاتی ہے
آنکھوں سے سانپ کے زہر کی منڈی میں گر پڑتے ہیں

اس دوران سُورج اُبھر آتا ہے
اور مَیں روٹی اور شراب کمانے کے لیے
کام شروع کر دیتا ہوں۔

لیکن وصیّت کرتے وقت
وہ اسے ذہن میں رکھتا ہے۔

نفرت کے لیے مَیں اپنی نعلیں چھوڑ جاؤں گا
میری ملّاح والی قمیض
میرے سیّاح والے جُوتے
میرا بڑھئی والا دِل
وہ تمام چیزیں جو میرے ساتھ رہیں
جنھوں نے مجھے رنج اُٹھانے میں مدد دی
مضبوط اور صاف چیزیں جو میرے پاس تھیں
ہمیشہ ہمیشہ اور وقت کے گزُرنے کے باوجود
تاکہ دُنیا کو پتا چلے کہ جن کے پاس درخت اور پانی تھا
وہ جہاز بنا سکتے تھے، انھیں چلا سکتے تھے
وہ جا سکتے ہیں، وہ واپس آ سکتے ہیں
وہ رنج اُٹھا سکتے ہیں، محبّت کر سکتے ہیں

وہ خوف بھی کھاتے ہیں، کام بھی کرتے ہیں
زندہ ہوتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں
وہ سادہ بھی ہوتے ہیں اور مشکل طبع بھی
وہ تکالیف پر کان بھی نہیں دھرتے
اور وہ صُبحِ بہاراں کے انتظار میں زندگی بھی گزار دیتے ہیں۔
یعنی یہ کہ وہ زندہ رہتے ہیں
ہر چند ہر زمانے میں چند ایسے فرعون ہوتے ہیں
جو ہماری زندگی کو زندگی ہی نہیں سمجھتے ہیں

بالآخر وہ وجد آور انداز میں اپنی محبوبہ سے خطاب کرتا ہے۔

مٹلڈے یوروٹیا! مَیں تمھارے لیے جہاں چھوڑ رہا ہوں
میرے پاس جو کچھ تھا، میرے پاس جو کچھ نہ تھا
مَیں جو کچھ تھا، مَیں جو کچھ نہ تھا
میرا پیار تو اس بچّے کی طرح ہے
جو تمھارے بازو نہیں چھوڑنا چاہتا ہے
مَیں ہمیشہ کے لیے یہ تم پر چھوڑتا ہُوں
تم میرا انتخاب جو ہو۔

تم میرا انتخاب جو ہو

تم ہَوا سے لرز جاتی ہو

جنوب کے پتلے درختوں سے بھی زیادہ، تم ہَوا سے

لرز جاتی ہو

اگست کی خزاں آلود جھاڑی سے بھی زیادہ تم ہَوا سے

لرز جاتی ہو۔

میرے لیے تم ایک عظیم بیکری کی طرح لذیذ ہو۔

تمھارے اندر ایک انسانی دل ہے

مگر تمھارے ہاتھ آسمانی ہاتھ ہیں

مصالحے دار پیاز کی طرح

تم سُرخ اور گرم

سفید اور نمکین ہو۔

تم ایک ہنستا ہُوا پیانو ہو

جس کا ہر راگ انسانیت سے پُر ہو

اور یہ موسیقی تمھاری پلکوں اور تمھارے بالوں سے

مجھے زیر زبر کیے جا رہی ہے۔

مَیں تمھارے سائے سے لپٹتا ہوں
مَیں تمھارے کانوں سے مسحُور ہوتا ہوں
ایسے جیسے مَیں نے انھیں پہلے بھی
گہرے سُرخ پانی میں دیکھا ہو۔
مَیں نے سمندر میں تمھارے ناخن کے دھوکے میں
ایک غضبناک مچھلی کو پکڑ لیا تھا۔
تمھاری آنکھیں جنوب سے جنوب کو کھُلتی جاتی ہیں۔
تمھاری مسکراہٹ مشرق سے مغرب کو جاتی ہے
تمھارے پَیر مشکل ہی سے نظر آتے ہیں
اور سُورج تمھارے بالوں پہ طلوع ہونے کو مسرّت کی
انتہا سمجھتا ہے۔
تمھارا چہرہ اور تمھارا جسم۔
سخت جگہوں سے بنا ہے۔ جیسا کہ میرا

بارش سے دُھلے ہُوئے متبرک مقامات
قدیم زمینوں اور قربان گاہوں سے میرا اور تمھارا

چہرہ اور جسم بنا ہے
ہماری خون آلود مٹّی میں
زندگی اب بھی گیت گاتی ہے
لیکن تم جنگل سے تمام چھُپے ہُوئے خوشبو کے خزانے
اُٹھا لائی ہو۔
اور تم جہاں جہاں سے گزُری ہو
وہ راستہ کسی جری کو انعام میں ملی ہُوئی
آب دار تلوار کی طرح جگمگا رہا ہے۔
تم نے مجھ پہ قابو
اپنے بے پناہ پیار اور لاثانی صلاحیتوں سے پایا ہے
کیونکہ تمھارے ذہن نے
قدیم زمانے، اگلے وقتوں کی تہذیب
اور اجداد کے گہرے رنگ کے ڈھولوں کی یاد تازہ کر دی ہے
مجھے اچانک محسوس ہُوا کہ میرا بُلاوا آگیا
یہ بہت دُور سے دھیمی اور نامعلوم آواز تھی۔
مَیں سُوکھے ہُوئے پتّوں کے نزدیک ہو گیا

مَیں نے تمھارے مُنہ میں اپنے خون کا بوسہ لیا۔
میرے پیار۔ میری آروکانا!

مسلڈرے! میَں تمھارے لیے کیا چھوڑ سکتا ہُوں
جب تم اپنے ایک لمس سے
جلتی ہوئی پتیوں کی ہَوا کو
سٹرابیری کی تیز مہک میں بدل دیتی ہو
اور تم اپنی سمندر چھاتیوں کے درمیان
کوکوئیز کی نیم وا روشنی
اور چلّی کی چمکدار پودوں کی خوشبو بسائے ہوئے ہو۔

سمندر میں خزاں بھرپور ہے۔
دُھند اور چُھپے ہوئے مقامات سے پُر
زمین پھیلتی اور سانس لیتی ہے
پتیاں ماہ بماہ گرتی ہیں
اور تم، صبر اور جذبے کے ساتھ

میرے کام پر جھکی ہوئی ہو۔
میری بُجھی بُجھی تحریر
کیڑے مکوڑوں اور مکڑی کے جالوں جیسے بدخط
اور کچّے لکھے ہوئے کاغذوں کو صاف کر کے لکھتی ہو۔
تم اپنے چھوٹے چھوٹے پیروں پر بھرپور شیرینی کی طرح ہو۔
میں تمھارے ہاتھوں کے صاف شفاف انداز کے بغیر
کیا کروں گا
میں بغیر کسی مقصد اور لگن کے
کہاں گھوموں گا
کیا میں آگ اور برف سے جگمگاتی
دُور جاتی بسوں میں آوارہ پھروں گا۔
مجھے تمھارا سمندری خزاں کا قرض ابھی ادا کرنا ہے
وہ سمندری خزاں جس کی جڑیں مرطوب ہیں
جو دھند میں انگور کی طرح لپٹی ہوئی
اور شہر میں چمکتے ہوئے باوقار سُورج کی طرح ہو
اور خاموشی کی وہ فضا

جہاں دُکھ اپنا آپ بھُول جاتے ہیں
اور جہاں خوشیوں کا چمکتا تاج ہی
سطح پر آتا ہے۔
مجھے تمھارا یہ سب قرض ادا کرنا ہے۔

میری بے زنجیر فاختہ
میری تاج والی بٹیر
میری پہاڑی چڑیا
کوہیکو کی میری ساتھی

جب ہم مر جائیں گے
جب ہماری سانس کی آمد و رفت بند ہو جائے گی
گور کی سات تہوں
اور مَوت کے خُشک پیروں تلے
ہم پھر مل جائیں گے۔ محبّت
تجسّس اور تحیّر پھر ہمارے گرد ہوں گے۔

ہمارے رنگ برنگے پر
ہماری پُرغرور آنکھیں
ہمارے پیر جو کبھی نہیں ملتے
ہمارے مرتسم بوسے
سب کچھ ایک ساتھ ہمیں واپس مل جائے گا
لیکن اس سے ہمیں کیا فرق پڑے گا۔
ہم قبر سے اور بھی قریب ہو جائیں گے!
اے زندگی! تو ہم سے جُدا نہ ہو
ہمیں موت کی کوئی فکر نہیں ہے۔

آخری ہدایات۔

پس مَیں تمھیں الوداع کہتا ہوں اے لوگو!
اتنے سارے الوداعیوں کے بعد
جبکہ میں کچھ چھوڑ کے بھی نہیں جا رہا ہوں
مَیں چاہتا ہوں کہ ہر ایک کے پاس کچھ ہو
سب سے طوفانی چیز جو میرے پاس ہے
جنوں خیز اور جوشیلی شئے، زمین کی جانب پلٹتی ہے

زندگی کی جانب پلٹتی ہے۔
نیک خواہشوں کی پتیاں
ہوا کے سبز دہن میں گھنڈیوں کی طرح گری ہیں۔

مگر میرے پاس دوستوں اور اجنبیوں کا
بہت عظیم فیض موجود ہے
میرے راستے مجھے جس طرف بھی لے گئے
مجھے فیّاضی ہی فیّاضی ملی
ایک رمز شناس دل کی طرح

دوائیوں کے بوجھ نے میری جلاوطنی کے ایام کو
کبھی دوبھر نہیں کیا
انھوں نے میرے ساتھ روکھی سوکھی
خطرات میں، پناہ میں اور عالمِ مدہوشی میں
ہر طرح گزری ہے۔
دُنیا نے اپنے پھلوں سے بھرے باغات میرے لیے کھول

اور میں ان میں ایسے داخل ہو گیا جیسے ایک مزدور
دو روپیہ عنایتوں کے بیچوں بیچ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے
میرے شمال میں اور جنوب میں بے انتہا دوست ہیں
مشرق میں میرے دوستوں کے سر پر کبھی سورج
غروب نہیں ہوتا ہے۔
اور شاید یہی حال مغرب میں بھی ہے
میں گندم کے دانے نہیں گن سکتا ہوں
بالکل اس طرح اوبار زونز میں
میں اپنے دوستوں کو گن سکتا ہوں
اور نہ ان کی تعداد بتا سکتا ہوں
امریکہ میں
رات کے خوفزدہ ماحول کے باوجود
کسی رات کا چاند ایسا نہیں جو مجھے نہ جانتا ہو
کوئی سڑک ایسی نہیں جو میری منتظر نہ ہو
گاؤں کے چھوٹے چھوٹے گھروندوں
شہروں کے پختہ مکانوں

اور دُور دراز محرابوں میں جنھیں
مَیں ابھی نہیں جانتا
سوائے اس کے کہ ہم بھائی بھائی پیدا ہوئے تھے۔
مَیں نے ہر جگہ شہد اکٹھا کیا
جسے ریچھ کھا گئے۔
بہاروں کی رازدارانہ آمد
ہاتھیوں کا دفینہ
اور جو کچھ کہ مَیں اپنوں کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں
میرے خاندان کا شفاف چشمہ ہے
لوگ میری تعریف بتاتے رہے
اور مَیں ان تمام لوگوں سے مختلف نہیں رہا
مَیں اپنی مُٹھّی میں
دُنیا کو تمام جزیروں کے ساتھ پکڑے ہُوئے ہوں
اور چونکہ مجھے تسلیم کرنے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔
مَیں نے اپنے دِل
سمندر اور ستاروں کا کہا کبھی نہیں ٹالا ہے۔

شاعر یہی مختلف انواع کی
قلبی اہمیتوں کے بیان
اور شاعری کے ایک ایمان
کی رونق کے ساتھ اپنی
نغمات کو ختم کرتا ہے ۔

اتنی بار پیدا ہونے کے باعث
سمندری مخلوق کی طرح
زندگی کا میرا تجربہ بھی نمکین قسم کا ہے ۔
جو ستاروں پر کمندیں ڈالنے
اور مادّی منزلوں کے حصول کے لیئے بے چین رہتا ہے ۔
پس مَیں چلتا ہوں بغیر جانے
کہ مَیں کس دُنیا کی جانب پلٹ رہا ہوں
یا مَیں یونہی زندہ بھی رہوں گا کہ نہیں ۔
جبکہ چیزیں اپنی سمت متعین کر رہی ہیں
مَیں اپنی وصیت چھوڑ چلا ہوں
میری تلوّن آمیز تحریریں
کہ اسے جو بھی پڑھے
وہ اس سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے گا
سوائے ایک صاف مگر متحیّر ذہن کے
مسلسل رواں رہنے کی داستان
ایک شخص جو سوگوار ، زندہ دل ، خوش

اور رنج خوردہ ذہن کا مالک تھا۔
اور اب مَیں اس شخص کے پیچھے جاتا ہوں
مگر غائب نہیں ہوں گا۔
مَیں شفاف ہَوا میں
آسمانی تیراک کی طرح غوطہ لگاؤں گا
اور پھر اپنی نشو و نما کی جانب مائل ہوں گا
جبکہ ایک دن مَیں اتنا چھوٹا ہو جاؤں گا
کہ ہَوا مجھے اپنے ساتھ اُڑا لے جائے گی
اور مجھے خود اپنا نام نہیں معلوم ہو گا۔
اور جب مَیں جاگوں گا تو مَیں وہاں موجود نہیں ہوں
اور پھر مَیں خاموشی میں گاؤنگا۔

# آندرئی وزنی سنسکی

وزنی سنسکی ۱۲۔مئی ۱۹۳۳ء کو ماسکو میں پیدا ہُوا۔
اس کے والد ہائڈروالکٹرک سٹیشن کے ڈیزائنر ہیں۔
اس کی والدہ ادب کی طالب علم ہیں
۱۹۵۰ء میں اس نے فنِ تعمیرات کے انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا۔
اُسی زمانے میں وہ نظمیں لکھنی شروع کر چکا تھا۔
پاسترناک اس کا پسندیدہ شاعر تھا۔
۱۹۶۰ء میں اس کا پہلا مجموعۂ کلام شائع ہُوا۔
اب تک اس کے کئی مجموعے چھپ چُکے ہیں۔
وہ سویت یونین کے مقبول ترین شاعروں میں سے ایک ہے۔
اس کی شاعری میں بیان کی جدّت اور جرأت کے علاوہ تجربے کی ندرت
اور خاص قسم کی کھُردری، مشینی موسیقی بھی پائی جاتی ہے۔
شعر میں جذبے پر فکر اور تجربے کا رنگ غالب ہے۔
وہ دُنیا کے کئی مُلکوں کا سفر کر چکا ہے۔
غیر مُلکی شاعروں میں اسے لورکا، ٹی۔ایس۔ایلیٹ اور ڈِلن ٹومس
زیادہ پسند ہیں۔

# خُود کلامی

مَیں مارلین منرو ! ہیروئن ہوں
مَیں خودکُشی اور خواب آور گولیوں کی ہیروئن ہوں
مرے عارضوں کے گلاب کس کے لیے کِھل رہے ہیں
مرے بے کراں قہقھوں اور جُملوں کی ٹیلی فون پر بازگشت کس کے لیے ہے
مری آبنوسی جگمگاتی الماری میں، لٹکے بالکل نئی تراش کے نئے لباس
چیخ چیخ کر کسے بُلا رہے ہیں
یہ لمحے ناقابلِ برداشت ہیں
ناقابلِ برداشت تو یہ بھی ہے کہ
زندگی محبّت سے عاری ہو
ناقابلِ برداشت تو یہ بھی ہے کہ

بید کے لرزیدہ شجر کی طرح، بے اماں زندہ رہو
ناقابلِ برداشت، خودکشی بھی ہے
مگر حد سے زیادہ، ناقابلِ برداشت
زندگی کرنا ہے۔
زندگی تو اِک بکاؤ مال ہے
زندگی تو مسلسل جھوٹے بوسوں کی اشتہا کا آئینہ ہے
جس طرح مالک کے آگے
ایک سِدھا گھوڑا، کبھی دُم کو ہلائے اور کبھی گردن جُھکائے
اس طرح مَیں نے زندگی میں اپنے سامنے کھڑے
فلموں میں لگائی دولتوں کے قبضہ گیروں کو دیکھا ہے
مَیں نے "ڈرائیوان" سنیما میں موٹر کاروں کی
ن قطاروں میں موٹروں کے اندر حدّتوں سے
اگل، تپے ہُوئے چہروں کو مارلین منرو کے اندر جھانکنے کی خواہش لیے
یاسے، تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔
ں نے دیکھا ہے
ن کے چہروں سے وہ رنگتیں پھوٹ رہی تھیں

جو کُتّے کو گوشت کی بُو پا کر بیتاب کر دیتی ہیں
یہ کیفیت نا قابلِ برداشت ہے
مجبوری کے عالم کی ہر کیفیت۔ نا قابلِ برداشت ہوتی ہے
مگر جس کیفیت میں ہم زندہ ہیں
اس عالم میں آزادی کے زمانے کی ہر کیفیت بھی نا قابلِ برداشت ہے۔
جس کا اِک رنگ وہ مُردہ زندگی ہے جو ہم سب کرتے ہیں
اس سے بڑھ کے نا قابلِ برداشت
اس بے کیف زندگی کے بارے میں تحقیق کرنا اور جان کاری کا
مرحلہ طے کرنا ہے

ہمارے سارے منصوبے کیا ہُوئے
ہماری سوچوں نے ہمیں خلا میں لٹکا دیا ہے
اب زندہ رہنا خودکُشی کے مترادف ہے
اب تو بُرائی سے لڑنا، گویا خودکُشی کرنا ہے
اب تو زر کی قوتوں سے نباہ کرنا۔ گویا خودکُشی کرنا ہے۔
اگر خرد کی زرکاری نہ ہو تو جینا نا قابلِ برداشت
مگر خرد کی چہرہ شناسی تو جینے کو اور بھی نا قابلِ برداشت بنا دیتی ہے

ہم خود کو دولت کے زہر سے مار ڈالتے ہیں

ہم اپنے آپ کیریئر کے بنانے کے جنوں میں گھول دیتے ہیں

اور آخر ہماری ٹانگیں، جمے ہوئے شہد کی طرح نظر آتی ہیں

ہم تمثیل کار!

آنے والی نسلوں کے تحفظ کے لیے تو نہیں جیتے

ہم تو فلم ڈائرکٹر کی ناانصافی کی ہر بنیاد میں مٹی، گارا بن کے گھل جاتے ہیں

ہم اپنے پیاروں سے بغل گیر ہو ہو کر، ان کا دم گھونٹ دیتے ہیں

مگر ہماری سوچیں ہمارے چہروں پر یوں جم جاتی ہیں

جیسے پگھلے تار کول کی سڑک پر ٹائروں کے نشان!

ہماری چیخیں، خود ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔

اے ہماری ماؤں! تم نے ہمیں کیوں پیدا کیا

اے میری ماں! تجھے علم تھا کہ تیرے خون کو لوگ خاک میں رلائیں گے

اے چمکتے ہوئے ابھرتے ہوئے فلم اسٹار!

ہمارے لیے تنہائی کی یافت ناممکن ہے

بسوں میں، شاہراہوں پر، سڑکوں اور بازاروں میں

ہر طرف۔ تحیر میں ملفوف آوازیں "وہ دیکھو ـــــ وہ مارلین منرو ہے"

شخصیت کی یہ بےبسی، ناقابلِ برداشت ہے۔

ہر اخبار، ہر رسالے، ہر پوسٹر میں موجود

مارلین منرو کو سب چاہتے اور جانتے ہیں

مگر اس دل سے بےخبر ہیں جو اس بےمعنی جسم کے اندر بجھ رہا ہے

مگر وہ تو

اپنی زندگی کا تلذذ تمھارے جسم کی جگمگاہٹ میں ڈھونڈتے ہیں

وہ تمھاری آنکھوں اور تمھارے چہرے سے اپنے ذہن کے مطابق

عیّاشی نچوڑتے ہیں

یہ سب یاد رکھنا۔ اُف خُدایا!

کتنا دردناک ہے۔

دیکھو۔ ایک طرف میری نیم برہنہ تصویر ہے

اور دوسری طرف دو سطروں میں تحریر ہے

مارلین منرو مر گئی...

پروڈیوسر نے اپنے پیٹ کا دوزخ بجھاتے ہوئے چیخ کر کہا تھا

تم تونگر یا ہو۔ تمھارے ابرُو تو بیش قیمت زر و جواہر سے بھی بیش قیمت ہیں

مگر تمھیں یہ خبر نہیں ہے کہ ان جواہر کی ساری شکلوں کی ایک صُورت

حسین جواں لڑکیو! خودکشی ہے۔

خودکشی تو وہی کرتے ہیں، جن کا جواں خون

بپھرے سمندر کی صورت ساحلوں کے خوف سے آزاد ہوتا ہے

بے تحاشا عالمِ بے ہوشی بھی تو خودکشی ہے

بڑی بڑی کُرسیوں والے اس عالم میں کیمرے کی چمک دیکھ کر

زرد پڑ جاتے ہیں

خودکُشیاں

خودکُشیاں

ابدی ہیروشیما تڑخ رہا ہے،

میری چیخیں ناقابلِ برداشت ہیں

ناقابلِ برداشت ہے، وہ انتظار

جو ہر چیز کے تباہ ہو جانے کی قید سے بندھا ہے۔

آخر کیوں ہاتھ سے مٹی کے تیل کا بھبکا اُٹھ رہا ہے

نیلگوں بلور پر ہاتھ ناقابلِ برداشت حد تک جل جاتے ہیں

اے اطلسی لباسو! الوداع

مَیں ایک کمزور عورت ہُوں

کیا میں کبھی کارِ جہاں کو دُرست کر سکوں گی

مگر اب نہیں

اب بس الوداع ..... الوداع .....

# جورج سیفیرس

۲۹- فروری ۱۹۰۰ء میں سمرنا میں پیدا ہُوا۔

۱۹۱۴ء میں اس کا خاندان ایتھنز میں منتقل ہوگیا۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۴ء تک پیرس میں تعلیم حاصل کی، اور ۱۹۲۴ء میں یونان کے سفارتی محکمے سے منسلک ہوگیا۔

سب سے پہلے اسے لندن میں تعینات کیا گیا۔ بعد میں وہ البانیہ میں قونصل بھی رہا۔ جنگ کے زمانے میں وہ آزاد یونانی حکومت کے ساتھ کام کرتا رہا، اور اس دَوران اسے کریٹ، جنوبی افریقہ، مصر، فلسطین، لندن اور اٹلی میں قیام کا موقع ملا۔ ۱۹۴۵ء میں آزادی کے بعد وہ واپس ایتھنز آ گیا۔ اپنے کام کے دَوران اسے ترکی، لبنان، شام، اردن اور عراق جانے کا اتفاق ہُوا۔ اس کے بعد وہ لندن میں سفیر مقرر ہُوا۔

۱۹۶۳ء میں اسے ادب کا نوبل پرائز ملا۔

بعد میں وہ سفارت کا عہدہ چھوڑ کر ایتھنز میں رہنے لگا، اور وہیں گوشہ نشینی کی حالت میں اس کا انتقال ہُوا۔

اس کی شاعری میں یونانی روایت کے اثر کے علاوہ یورپ کی

جدید علامتی شاعری کا اثر نمایاں ہے۔ خاص طور پر وہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ سے متاثر تھا۔ ایلیٹ کی نظم "ویسٹ لینڈ" کا اس نے یونانی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔

# منظر

شام یوں آتی ہے!
جیسے ایک چڑیا جس کے پر ٹوٹے ہوں
اور جو سالہا سال تک اُڑتی رہی ہو
وہ چڑیا جو اَب تمازت اور ہَوا بھی
برداشت کرنے کے قابل نہ ہو،
شام یوں آتی ہے!

سبز گھاس پر
تین ہزار فرشتوں نے تمام دن ننگے تانبے کی طرح رقص کیا ہے
اور پھر زرد شام ہوتی ہے
تو تین ہزار فرشتے اپنے پروں میں چھُپ کر کُتّا بن گئے،

جیسے سب بھول چکے ہیں
جو تنہائی میں بھونکتا ہے
اپنے آقا کو تلاش کرتا ہے
یا ظہورِ ثانی کے انتظار میں ہے
یا پھر کسی ہڈّی کو چبانے کا خواہاں ہے۔

اب مجھے صرف اور صرف خاموشی کی تمنّا ہے
اب مجھے کسی پہاڑی پر یا ساحلِ سمندر پر
ایک جھونپڑی کی تمنّا ہے
اور مَیں اس جھونپڑی میں کھڑکی کے سامنے
نیلے سمندر کی طرح پھیلی ہوئی نیلاہٹ دیکھنا چاہتا ہوں
مَیں چاہتا ہوں میرے واز میں
تار پہ منڈھے ہُوئے کاغذ کی شکل میں مصنوعی کارنیشن ہی لگا ہو
تاکہ اُسے ہَوا آسانی سے اپنے قابو میں کر سکے۔

شام ہو گی
بھیڑوں کے گلّے خیابانوں کی سمت ایک اچھے خوشگوار تصوّر کی طرح پلٹیں گے

اور میں سونے کے لیے لیٹ جاؤں گا

کیونکہ میرے پاس روشن کرنے کے لیے ایک موم بتّی بھی نہیں

روشنی نہیں کہ میں پڑھ سکوں۔

# آئینے میں

میرے سینے کے زخم پھر جلنے لگتے ہیں
جب ستارے اُتر کر میرے جسم و جاں میں گھُل جاتے ہیں
اور جب لوگوں کے قدموں تلے خاموشی کچلی جاتی ہے ۔

وقت کے سمندر میں یہ ڈوبتے پتّھر
مجھے کب تک اپنے ساتھ گھسیٹتے چلیں گے
یہ پھیلا ، بپھرا سمندر
کون اسے خشک کر سکے گا ۔

مَیں ہر صُبح اپنے ہاتھوں کو ذلّت اور پراگندگی میں آلودہ دیکھتا ہوں
مَیں ایسا کرنے پر مجبُور ہُوں
مَیں اذیتوں سے بنی ہوئی ایک چٹان ہوں

مَیں دیکھتا ہوں کہ درختوں نے مُرے ہُوؤں کی سیاہ طمانیت کو جذب کر کے
مُسکراہٹوں کو سجایا ہے
مگر یہ وہ مُسکراہٹ ہے جو مجسموں کے چہروں پہ عیاں نہیں ہوتی ہے

---

# مختصر نظمیں

دو تلخ لمحوں کے درمیاں
تمھیں سانس لینے کی مہلت نہیں ملتی ہے
تمھارا چہرہ تمھارے اپنے چہرے کے مقابل ہوتا ہے
تمھارے چہرے پہ بچّے کی سی معصومیت
آتی ہے ، غائب ہو جاتی ہے ۔

---

ہر صُبح پانی کی گرمی مجھے یاد دلاتی ہے
کہ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چیز
زندہ نہیں ہے ۔

---

سمندر کی جانب مت دیکھو
جھاگ بناتی ، دُور پھیلتی لہروں کو مت دیکھو
آسمان تلے ہم تو خود مچھلیاں ہیں
اور درخت سمندری گھاس ہیں

---

چاہے روشنی ہو یا اندھیرا
چنبیلی تو سدا سفید رہتی ہے

---

اس دُنیا نے اپنی رنگت کھو دی ہے
یہ پچھلے سال کی سمندری گھاس کی طرح ہے
خشک اور سرمئی
جو ہَوا کے رحم و کرم پر ہوتی ہے
یہ طویل سمندر اور دو آنکھیں
تیز مگر بے حرکت ہَوا کی طرح
اور میرے پتوار اس وقت تک ہیں
جب تک موجود ہیں

اَور میرا خُدا بھی

---

سارے شہر میں گھنٹیوں کی آواز
یوں گونج رہی ہے جیسے سِکّے گر رہے ہیں
ہر نئے انداز کے ساتھ ایک نیا دَر
روشن ہو جاتا ہے
جیسے زمین پر پانی کا ایک قطرہ
وہ لمحہ آگیا ہے
اب مجھے اُوپر اُٹھاؤ

---

نیند نے اسے پھلوں اور بتّیوں کے خوابوں سے بھر دیا
بیداری نے اسے ایک رس بھری بھی اُٹھانے پر مجبور کیا
اور دونوں نے مل کر اس کے اعضا کو خواہش زدہ عورتوں
میں تقسیم کر دیا۔

---

مَیں سو رہا ہوں اور میرا دل بیدار ہے

یہ ستاروں، آسمان اور افق
اور جہاز کے عرشے پر کھِل کھِلا کر
پھیلتے پانی کو گھور رہا ہے

---

سمندری غاروں میں بھی
پیاس اور محبّت بستی ہے
سمندری غاروں میں بھی خود لذّتی کی کیفیت
بالکل اسی طرح سخت دکھائی دیتی ہے
جیسے ایک سیپی جسے تم اپنی ہتھیلی پہ
رکھ لیتے ہو۔

---

سمندری غاروں میں
سارا سارا دن ، مَیں نے تمھاری آنکھوں میں
جھانکا ہے۔
مَیں تمھیں نہیں جانتا تھا۔
اور تم بھی مجھے نہیں جانتی تھیں

---

تین لال کبوتر روشنی میں
ہماری تقدیر لکھ رہے ہیں
لوگوں کے ساتھ ہماری محبتوں اور رفاقتوں کے رنگوں
اور عکسوں میں وہ ہماری تقدیر لکھ رہے ہیں ۔

---

# کینتھ پیچن

کینتھ پیچن ۳ دسمبر ۱۹۱۱ء کو امریکہ کی ریاست اوہایو میں پیدا ہُوا۔
سکول میں تعلیم پانے کے بعد، سترہ سال کی عمر میں اپنے باپ کے
ساتھ فولاد کے کارخانے میں کام کرنے لگا۔
اس کے بعد کافی عرصے تک وہ آوارہ پھرتا رہا۔ جہاں بھی کوئی کام
ملتا کر لیتا۔

۱۹۳۶ء میں اسے ایک ادبی وظیفہ ملنے لگا۔
اس کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۳۶ء ہی میں شائع ہوا۔
اس مجموعے کی نظمیں انقلابی جوش اور ہیئت کے تجربوں سے پُر تھیں۔
بعد کے مجموعوں میں ٹھہراؤ اور پختگی آتی گئی۔
پیچن کی بیشتر تخلیقات خوفناک خوابوں کی دُنیا میں تشکیل پاتی
ہیں۔ ایسی دُنیا جس میں مزاح بھی ہیبت ناک بن جاتا ہے۔ یہ جنونی کیفیات
کی دُنیا ہے۔
پیچن نے شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھی۔ وہ کئی ناولوں کا بھی
مصنّف ہے۔

اس کی صحت خراب رہتی تھی، اس کے باوجود اس نے پچیس
زیادہ کتابیں لکھیں۔

اس نے امریکہ کی بول چال کی زبان کو بڑی مہارت سے استعما
کیا ہے۔

اس کی تحریریں بدصورتی، تشدّد اور دھوکے بازی کے خلا
احتجاج سے لبریز ہیں۔

پیچن نے جنوری ۱۹۷۲ء میں وفات پائی۔

# آؤ ہم کھل کے پاگل پن کا مظاہرہ کریں

اے میری نسل کے لوگو!
آؤ ہم کھل کے پاگل پن کا مظاہرہ کریں
ہمیں اس عہدِ بربریت کے نقشِ قدم پہ چلنا چاہیے۔
ہم وہ جہت بھی دیکھیں
جو عصر کی دھندلی سرزمین کو
ابد کے بے در گنبدوں میں مقید کر کے
اس آواز سے بھرپور ہو جو موت کی آواز ہو
اس چہرے کے رنگ لیے ہو، جو مردہ چیزوں پر
بن کہے ہی جم جاتے ہیں۔

ہم بہت کچھ چاہتے تھے

ہم اک فراخ در اور بے پناہ چاہت کی خواہش میں
خاک بسر ہوئے
ہم نے دنوں کی خُبث آمیز تاریکی کو بدلنے کی کوشش کی
لیکن،
اس سرزمین پہ
اور اس سرزمین کے فرسودہ ذہنوں کی
بڑی بڑی قبروں پر
تا حدِ نظر پھیلے ہُوئے دوزخ اور دُھندلاہٹوں کے سوا
ہمیں کچھ نہ ملا۔

# لیوپولڈ سیدار سینگھور

لیوپولڈ سیدار سینگھور ۹۔اکتوبر ۱۹۰۶ء کو سینیگال میں پیدا ہُوا۔
اس کا باپ ایک امیر زمیندار تھا۔
اس کا خاندانی مذہب رومن کیتھولک تھا۔
جوانی میں وہ پادری بننے کا خواہاں تھا۔
لیکن آہستہ آہستہ اس کا یہ شوق ماند پڑ گیا۔
۱۹۲۶ء میں جب اس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تو اس کے اُستادوں نے اس کی غیر معمولی قابلیت سے متاثر ہو کر اس کے لیے پیرس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا انتظام کروا دیا۔
پیرس ہی میں اس کے اندر شاعری کا بے پناہ شوق پیدا ہُوا۔
بودلیئر کی شاعری پر تھیسس لکھ کر اُس نے فلسفے کے شعبے میں داخلہ لے لیا۔ سند حاصل کرنے کے بعد وہ گرامر سکول میں اُستاد مقرر ہو گیا۔
جنگ کے دوران اسے فوجی خدمت کے لیے بُلا لیا گیا۔ فرانس کی شکست کے بعد وہ جرمنوں کی قید میں بھی رہا لیکن ۱۹۴۲ء میں اُسے دوبارہ معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت مل گئی۔
اسی زمانے میں وہ سیاست میں دلچسپی لینے لگا۔

۱۹۴۵ء میں وہ سینیگال کی دستور ساز اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا۔

۱۹۶۰ء میں وہ جمہوریہ سینیگال کا پہلا صدر منتخب ہوا۔ جس عہدہ پر وہ آج تک فائز ہے۔

سینگھور کی شاعری ۱۹۴۵ء سے شائع ہو رہی ہے۔

وہ فرانسیسی زبان میں لکھنے والے افریقی شاعروں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

وہ انسان دوستی اور سوشلزم پر ایمان رکھتا ہے۔

# سیہ عورت

برہنہ عورت ، سیہ عورت
تم اپنے رنگ میں ملبوس ہو
یہی زندگی ہے
تم اپنے جسم کے خطوط میں گم ہو
یہی خوبصورتی ہے
مَیں تمھارے سائے میں جوان ہُوا ہوں
تمھارے ہاتھوں کی نرمی ، میری آنکھوں کو سکون بخشتی رہی ہے
اور اب سُورج کی تمازت میں نہائی ہوئی
چوٹی کی بلندی پر
گرمی کی انتہا!

اور دو پہر کے عروج کے ساتھ
اے مری ارضِ موعودہ
میں تمھارے پاس آگیا ہوں
تمھاری خوبصورتی میرے دل میں
چیل کے جھپٹّے کی طرح اُترلگتی ہے ۔

برہنہ عورت ۔ سیہ عورت
پکے ہوئے گودے سے بھرے ہُوئے پھل
سیہ شراب کی خزینہ لذّت
ایسا دہن جو میرے دہن کو بھی تغزل بخشے
افق تا افق پھیلے ہوئے سبزہ زار !
سبزہ زار ، جو مشرقی ہَواؤں کی ناز برداری
کے باعث جوان ہیں
فاتح کی اُنگلیوں سے نقش و نگار بناتے ہوئے
ٹام ، ٹام ۔ ٹاٹ ۔ ٹام ، ٹام ، جیسے نعرے
تمھاری نازک نسوانی آواز ، محبُوبہ کا روحانی گیت ہیں ۔

برہنہ عورت ، سیہ عورت

تیل جسے سانس منتشر نہیں کر سکتا

پُرسکون تیل ، کھلاڑی کے اعضا پہ

مالی[1] کے شہزادوں کے اعضا پہ ،

اے غزال ! تمھارے اعضا جنّت میں بنے ہوئے ہیں

موتی ، تمھاری رات نما جلد پہ

ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں

ذہنوں کی خوشیاں

تمھاری آبدار جلد سے رگڑ کر ،

سُرخ سونے کا چمکنا

تمھارے بالوں کے سائے میں ،

تمھاری آنکھوں کے سُورجوں کی دوسراہٹ میں

میری حفاظت کی ذمّہ داری ، ذرا آسان ہو جاتی ہے ۔

برہنہ عورت ، سیہ عورت

مَیں تمھاری اُس خوبصورتی کے بارے نوحہ گر ہوں

---

[1] مُلک کا نام

جو گزر رہی ہے۔

میں تمھارے لیے وہ ابدی پیکر تخلیق کرتا ہوں

جسے قسمت کے حاسد ہاتھ

راکھ کی طرح، زندگی کے درخت کی جڑوں کو

غذا دینے کے لیے بکھیر دیتے ہیں۔

---

# فروغ فرّخ زاد

جدید ایران کی یہ منفرد شاعرہ ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئی اور
۱۹۶۶ء میں ایک کار کے حادثے میں اس کا انتقال ہوا۔
فروغ کی نظموں کے چار مجموعے اسیر، دیوار، عصیان اور تولدِ دیگر
ہیں جو اس کی زندگی میں ہی چھپ گئے تھے۔
فروغ کے موضوع عشق، حسن اور موت ہیں۔ یہ سب مضامین
عورت کے چہرے کے گرد گھومتے ہیں، جو خود اس کا چہرہ ہے۔
حسن اس کی صفت، عشق اس کا خمیر اور موت (اپنی یا محبوب کی)
اس کی تقدیر ہے ——— وہ اپنی شاعری میں عورت کے دل کے
وہ اسرار بیان کرتی ہے جو خود عورت کی زبان پر کم آتے ہیں۔
فروغ کے پہلے تین مجموعے بچپن کی یادوں سے بھرے ہوئے ہیں۔
لیکن آخری مجموعے "تولدِ دیگر" میں فروغ کا عشق نئے ابعاد میں داخل ہوتا ہے۔
اب یہ صرف ذات کا عشق نہیں۔ گزرے ہوئے دنوں کی سرمستی کا عشق
نہیں بلکہ انسان کا عشق ہے۔ سچائی کا، سچے فنکار کا، سچی شاعری کا۔
فروغ کی شاعری مجموعی طور پر فکری شاعری نہیں ہے۔ لیکن فروغ
کو زندگی کے حسن سے جو گہرا عشق ہے وہ کسی اور موجودہ شاعر میں کم ملتا ہے۔

فروغ کے پہلے مجموعے "اسیر" میں ایک عورت کا آہ و نالہ سُنائی دیتا ہے۔ آزادی کے لیے اس کی پکار سنائی دیتی ہے۔ ایک ایسی عورت کی پکار جو گھر کے دھندوں میں بُری طرح گھری ہو۔ اور ان مجبوریوں سے اکتا کر بھاگ جانا چاہتی ہو۔ "دیوار" اور "عصیان" میں تمام مروّجہ عقائد کے خلاف تند و تیز آوازے سنائی دیتے ہیں۔ "تولدِ دیگر" کی نظمیں زیادہ پختگی کی حامل ہیں۔ ان میں اس کے درد نے ایک حد تک عمومیت پالی ہے۔ ان نظموں کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ یہی اس کی تمام شاعری میں انسانیت کے لیے امید کا ایک روزن ہیں۔ اور ان ہی میں اس کے عشق نے ایک نیا عرفان پایا ہے۔"

اقتباس (ن۔م۔ راشد)

# فشارِ زرد

مجھے یہ شوق بھی نہیں کہ مَیں زمیں کی خاک
آسمان کا ستارہ بن کے جی رہوں
مجھے یہ آرزُو نہیں کہ برگزیدہ ہستیوں کی شکل میں
ملائکِ سپہرِ عنبریں کی ہم نشیں بنوں
مَیں اس زمیں کی خاک ہوں
ستارہ بن کے جی نہ پاؤں گی کبھی
مرا یہ خاک خاک جسم
میانِ دشت، سوکھی گھاس کی طرح، اُجاڑ بے بہار ہے۔
مگر مجھے یقین ہے
نئی بہار کی سُبک قدم صبا
مرے وجود سے ملے گی
تو مَیں بھول جاؤں گی

ہر ایک چہرہ دستِ خزاں

کھلے گا بازیافت کا سنہرا در

یہ بازیافت
زندگی کی کالی کوٹھڑی کے بازوؤں میں ہو سکے گی کیا

یہاں تو عشق بے مزہ، دھوئیں کے جالے بن کے
کوٹھڑی کی چھت سے اب زمیں تلک پہنچ چکا۔

صدا کہاں، کہ حرف بے زبان ہیں
وفا کا جسم، زہرِ اجتناب پی کے
مدّتوں کا سو چکا
وہ آنکھ جس میں شائبے سے خواب کوئی جاگتا
وہ آنکھ دُودِ سرزنش کے گھاؤ کھا کے بجھ گئی

نہ ہونٹ ہیں، نہ حرف ہیں
زباں نہ خواب اور نہ جسم
مگر یہ جاں جو ہچکیوں کی شکل میں
فشارِ زرد کے سوا کچھ اور بھی نہیں

بضد ہے بازیافت پر۔

# آتشِ خاموش

رات اندھیری ، طویل راستہ اور مَیں حیران ،
وہ مرے راستے میں فانوس پکڑے کھڑا ہے
فانوس کے شعلۂ بے شکیب کو
میری نگاہ وحشت زدہ ہو کر دیکھتی ہے۔
ہم پہ کیا گزُرتی ہے —— کسی کو کیا معلوم
بھیگے ہوئے سبزے کا بستر کہتا ہے
میری گردن سے اپنے لب پیوستہ کر دو
ہزاروں جلتے ہوئے بوسے تمھارا استقبال کریں گے۔
ہم پہ کیا گزرتی ہے ، کسی کو کیا معلوم
مَیں " وہ " بن جاؤں

وہ جو دریا کے خروش جیسا ہے۔
مَیں بگولے کی طرح وحشی ہوں
وہ صحرا میں ٹھنڈی ہَوا جیسا ہے،
مَیں اُس کے بازوؤں میں ہوں اور تشنہ ہوں
میرا شوق مجھے گھاس کی طرح روندتا رہے گا
جب تک کہ مَیں ان لرزتے ہُوئے شگوفوں کا عرق
رات کے جام میں انڈیل کے پیاس بجھاؤں
بھیگے ہُوئے سبزے کے بستر پہ
بے دم، شعلوں میں لپٹی ہوئی پڑی ہوں
ڈرتی ہوں کہیں یہ بے پروا نسیم
اگر مُجھ سے آ کے یونہی لپٹتی رہی
تو میرے پیکر میں شوق کی روندی ہوئی گھاس پھر سر اُٹھا لے گی

# براگو ڈیوپ

۱۹۰۶ء میں ڈاکر، سینیگال میں پیدا ہُوا۔ سکول کی تعلیم کے بعد اس نے امورِ حیوانات کے سرجن کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد کئی سال تک امورِ حیوانات کے افسر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس کا مجموعۂ کلام ۱۹۶۰ء میں شائع ہُوا۔ اس نے بہت سی افریقی کہانیوں کو فرانسیسی میں منتقل بھی کیا ہے۔ اس کی شاعری میں مقامی روایات کا اثر نمایاں ہے۔

# یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے

انسانوں سے زیادہ اشیا کی باتیں سنو۔

سنو۔ آگ کی آواز

سنو۔ پانی کی آواز

سنو۔ ہواؤں میں درختوں کی سسکیوں کی آواز۔

یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے۔

مرنے والے ہمیشہ کے لیے نہیں جاتے ہیں

وہ زرد سایوں میں موجود ہیں

وہ گہرے ہوتے ہُوئے سایوں میں موجُود ہیں

وہ جو مر گئے ہیں۔ وہ زمین کے نیچے ہیں

وہ ہلتے ہوئے درختوں

گھنے جنگلوں

بہتے پانی

کھڑے پانی

اور پُر ہجوم بستیوں میں موجود ہیں

مرنے والے مَرا نہیں کرتے ہیں

انسانوں سے زیادہ اشیا کی باتیں سنو

سنو۔ آگ کی آواز

سنو۔ پانی کی آواز

سنو۔ ہواؤں میں درختوں کی سسکیوں کی آواز

یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے۔

وہ مر نہیں گئے

وہ زمین کے نیچے نہیں ہیں۔

وہ مُردہ نہیں ہیں

مرنے والے ہمیشہ کے لیے نہیں جاتے ہیں

وہ عورت کی چھاتیوں

بچّے کی چیخوں اور چمکتی چنگاریوں میں موجود ہوتے ہیں

وہ جو مر گئے ہیں۔ زمین کے نیچے نہیں ہیں
وہ بھڑکتی ہوئی آگ
روتے ہوئے پودوں
کراہتی چٹانوں
جنگلوں سے بھری ہوئی جگہوں اور گھروں میں موجود ہیں۔
مرنے والے مرا نہیں کرتے
انسانوں سے زیادہ اشیا کی باتیں سنو۔
سنو۔ آگ کی آواز
سنو۔ پانی کی آواز
سنو۔ ہواؤں میں درختوں کی سسکیوں کی آواز
یہ ہمارے اجداد کی سانسوں کی آواز ہے۔

# رومانیہ کے شاعر

**آئیون مینولیسکو :**

پیدائش ۱۸۸۱ء ، وفات ۱۹۴۴ء

شاعری کے چار مجموعے ، ڈراموں کے دو مجموعے ، نثر کے سات مجموعے شائع ہوئے۔

**ایمل ایساک :**

پیدائش ۱۸۸۹ء ، وفات ۱۹۵۵ء

شاعری کے چھ مجموعے اور ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔

**آئیون پلاٹ :**

پیدائش ۱۸۹۱ء ، وفات ۱۹۴۵ء

شاعری کے بارہ مجموعے ، ڈراموں کے دو اور مضامین کے دو مجموعے شائع ہوئے۔

**ڈیموستین بوتیز :**

پیدائش ۱۸۹۳ء ، ابھی حیات ہیں

شاعری کے گیارہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

## لوسیان بلاگا :

پیدائش ۱۸۹۵ء ، وفات ۱۹۶۱ء

شاعری کے آٹھ مجموعے ، ڈراموں کے پانچ ، فلسفے پر چار کتابیں

یادداشتوں پر مشتمل ایک مجموعہ مضامین اور تنقید کی دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

## آئیون وینیا :

پیدائش ۱۹۰۰ء ، وفات ۱۹۶۴ء

شاعری کا ایک مجموعہ ، ایک ناول اور نثر کے تین مجموعے

شائع ہوے ہیں۔

## الفلیپیڈ :

پیدائش ۱۹۰۰ء ، ابھی حیات ہیں۔

شاعری کے سات مجموعے اور تنقید کا ایک مجموعہ شائع ہُوا ہے۔

## راڈو بوریئیو :

پیدائش ۱۹۰۶ء

شاعری کے گیارہ مجموعے اور نثر کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

## ویرونیکا پورم باکو :

پیدائش ۱۹۲۱ء

کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم کارکن ہیں۔ خواتین کی شاعری کا ایک

بین الاقوامی انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ بہت چابک دست مترجم اور

مشہور مؤلف ہیں۔ دس شعری مجموعے اور تین سفرنامے شائع ہو چکے ہیں۔

## سٹیفان آگسٹن ڈوئیناس :

پیدائش ۱۹۲۲ء

سترہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ فرانسیسی تراجم میں بہت مشہور ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ۴۰ سال کی عمر میں شائع ہوئی مگر اس کے بعد ان کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ اب تک تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

## نیناکسان :

پیدائش ۱۹۲۴ء

بچپن ہی سے شاعری کرتی ہیں۔ شعری حسیات سے بھرپور شاعری کے ۱۲ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جرمن اور فرانسیسی تراجم کے علاوہ بچوں کے لیے نظمیں لکھنے کے لیے بھی مشہور ہیں۔

## آئیون ہورا :

پیدائش ۱۹۲۹ء

رائٹرز یونین کے سکریٹری ہیں۔ نئے شعری آہنگ کے لیے بہت مقبول اور مشہور ہیں۔

## تیبر یواتان :

پیدائش ۱۹۳۰ء

ادبی صحافت میں بہت مشہور ہیں۔ رائٹرز یونین کے ہفتہ دار جریدے کے ۱۹۶۶ء تک مدیر رہے۔

## اورل رائیٹو:

پیدائش ۱۹۳۰ء

رائٹرز یونین کی نیشنل ایگزکٹو کے ممبر ہیں۔ مغربی یورپین ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اطالوی، ہسپانوی اور فرانسیسی ادب کا ترجمہ کیا ہے۔ شاعری کے چھ مجموعے اور ایک سفرنامہ شائع ہُوا ہے۔

## نکولائی لیبس:

پیدائش ۱۹۲۵ء، ۱۹۵۶ء میں ٹرک کے ایک حادثے میں مارے گئے۔ ان کا بچپن دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں، افلاس اور تباہ کاری سے نبرد آزمائی میں گزرا۔ شاعری میں ان صعوبتوں کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ شاعری کے ۵ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

## نیچیپا سٹینسکیو:

پیدائش ۱۹۳۳ء

رومانیہ کے سب سے متنازعہ شاعر ہیں۔ رائٹرز یونین کا ۱۹۶۴ء کا شاعری کا انعام ملا اور اب ادبی رسالے کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں۔

## مارن سوریسکو:

پیدائش ۱۹۳۶ء

فلسفے کے طالب علم رہے۔ اینیما فلم سٹوڈیو میں پروڈکشن ایڈیٹر کے طور پہ کام کرتے ہیں۔ شاعری کے پانچ اور ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہُوا ہے۔

## اینا بلینڈیانہ :

پیدائش ۱۹۴۲ء

نجارسٹ میں ایک رسالے "ایمفی تھیٹر" میں کام کرتی ہیں۔

وہ رومانیہ میں خصوصی نسوانی لہجے کے لیے مشہور ہیں۔ شاعری کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

آئیون مینولیسکو

# تین گیتوں کا گیت

مَیں نے اپنے آپ سے کہا تھا
مَیں تین گیت لکھوں گا
اور ان تینوں گیتوں میں
مَیں تین لاشیں دفن کر دوں گا
مَیں ان لاشوں کو تانبے کے تین تابوتوں میں
دفن کر دوں گا
تین لمحے
بنجر، بے حس
سکّے کی طرح میری چھاتی سے چمٹے ہُوئے ہیں
تین بے جان اور بے حس نجوم کی طرح
جو غیر یقینی کیفیت کے باعث، نظر سے اوجھل ہو گئے ہوں
سائپرس کی شاخ پہ لٹکے تین لاروں کی طرح

پھر مَیں نے اپنے آپ سے کہا
مَیں پہلا گیت فلورنس کے رہنے والے کی طرح لکھوں گا
جیسا کہ ڈانٹے نے لکھا ہوگا
جبکہ وہ بیٹرس سے ملا تھا
اور مَیں اس کی ہر لائن کو سونے سے بھر دُوں گا
اتنا سونا ، اتنا سونا
جتنا کہ پہلے معتقد نے پہلے عیسائی کی قبر پر لاد دیا تھا۔
دوسرا گیت ،
مَیں لزبین انداز میں لکھوں گا
لیز بوز کی پاگل مغنّیہ عورتوں کے انداز میں
جیسے وہ محبّت کے گیت گاتی ہیں
مَیں اسے سُرخ رنگ سے بھر دُوں گا
مَیں خوش بخت بیسواؤں کے ہونٹوں سے
یہ سُرخ رنگ کشید کروں گا
اور تیسرے گیت کے لیے
مَیں سب سے دُکھ بھری شکل انتخاب کروں گا

مَیں اِس میں جذبات کی وہ حدّت اور شدّت تحلیل کروں گا
کہ قطبی ویران راتوں میں بھی ان کی دلسوزی
کی کراہٹیں گونجیں گی
مَیں اسے سبز رنگ سے بھر دوں گا
دلدلوں میں اُگے سبزے جیسا سبز رنگ
کہ جہاں وہ لوگ جو محبّت کے رجز سے عاری ہوں
محبّت کو دفن تو کر سکیں۔

تو مَیں نے خود سے کہا
مَیں تین گیت لکھوں گا
مگر تمام پرانے سونے اور ہونٹوں کے سُرخ رنگ میں سے
صرف ایک دھبّہ باقی رہ گیا ہے
ایک سبز دھبّہ۔ وہ اس قدر بوجھل ہے جیسا کہ قبر کا پتّھر
جس کے نیچے، تین تابوتوں میں گٹار کے تین تار
سوئے ہُوئے ہیں۔ اور گٹار
کہیں نہیں ہے۔

---

ایمل ایساک

# واپسی

کسان کام سے واپس ، گھروں کو پلٹ رہے ہیں
ان کے چہروں پر عمر گزرنے کا نوحہ رقم ہے
ان کے ہل اور ان کے پھل
رنج و محن کا آئینہ ہیں
اور چہرے آنسوؤں سے عرق عرق ہیں
وہ چہرے نیوڑھائے ، بے دلی سے چل رہے ہیں
ان کی رُوحیں بوجھل ہیں
اور ان کی جیبیں خالی ہیں
جیسے ہی وہ ان کی طرف آتے ہیں
سُورج ، ایک آدرشش کی طرح

ان پر شعاع افروز ہوتا ہے۔
تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتے ہُوئے
وہ گھروں کی سمت جاتے ہیں
ایک کھُلی ہوئی بگھی ان کے پاس سے گزرتی ہے
جس میں امرا اور بیگمات
زیورات اور خوشبوؤں میں بسے ہوئے ہیں۔
جیسے یہ ان کے پاس سے گزرتی ہے
کسان ہمیشہ کی طرح
بُزدلی کے ساتھ برہم ہوتے ہیں،
"زندگی یہی ہے"
ہم گندم کی فصل اُگاتے ہیں
اور یہ "لوگ" کھاتے ہیں

آئیون پلاٹ

# ایک لائن کی نظمیں

## رقاصہ

اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہُوا تھا
بغیر کسی حرکت کے وہ چلی جاتی ہے۔

## شاعرانہ فن

یہ الفاظ نہیں۔خامشی ہے
جو کہ ایک گیت کو اُس کا حسن بخشتی ہے۔

## نشاطِ شب

پاپلر کی وہ رات تمھیں یاد ہے
جب زرد چاند بھی ہمارا ہم سفر تھا۔

ڈیموسٹین بوتیز

# شناخت

لامحدود ، دُنیا ، دائم و قائم ہے
مَیں اس ساری دُنیا کو کبھی بھی نہ دیکھ سکوں گی
مَیں نقشوں کے حوالے سے اَن دیکھے مقامات کا
تصوّر باندھتی ہوں ۔
مَیں اٹلس سے کان لگا کر
ان علاقوں کی آوازوں کو سُننے کی کوشش کرتی ہُوں
مَیں خیالوں میں گھنے جنگل ، پھیلے ہُوئے صحرا
اور چاندی سے چمکتے ، مگر راستہ بدلتے دریاؤں کی راہ گزر دیکھتی ہوں
مَیں مشرق کی جانب اپنی آنکھوں کو مرکوز کر دیتی ہوں ۔

یہ سوچ کر کہ مَیں ایورسٹ کو دیکھ رہی ہوں ،

اور پھر مَیں شام کی خامشی سے کان لگا کر بیٹھتی ہوں
کہ شاید، مَیں نیاگرا کی مترنّم آواز سُن سکوں
مَیں خواب میں
قطبِ شمالی کے سفید ریچھوں کو دیکھتی ہوں
فیورڈ کی چٹانوں میں
پنچھوں کے گھونسلوں کو دیکھتی ہوں
اور سمندروں کی وسعتوں میں
آہستگی سے بڑھتے ہُوئے، جہازوں کو دیکھتی ہوں
جو کہ بڑھتی اور پھیلتی افق کی جانب رواں ہیں۔

مَیں ساری دُنیا کے لوگوں کو جاننا چاہتی ہوں
مَیں ان سب کو ان کے ناموں اور ان کے اندازِ بیان
تک کے حوالے سے جاننا چاہتی ہوں
تاکہ میرا چہرہ ناشناسا نہ رہے
اور ان تمام چہروں، ان تمام لہجوں میں میرا بھی کچھ حصّہ ہو۔

لوسیان بلاگا

# مَیں تمھارے سامنے رُک گیا

مَیں ہر جگہ ایسے سائے کی تلاش میں بھٹکا ہوں
جو کسی چہرے پہ سجی لمبی پلکوں تلے میسر ہو
مَیں اس سائے کی تلاش میں مشرق و مغرب
اور پریوں کی کہانیوں کے مُلکوں میں مارا مارا پھرا ہوں۔

یہ بہت دیر سے ہُوا ، جب مَیں نے اسے پایا
یہاں میرے اپنے مُلک میں ، اپنے ہی لوگوں کے درمیان
مَیں تمھارے سامنے اس وقت آکر رُکا ، جب تم خاموش تھیں۔
تم نے مجُھ سے کہا "مجھے مت چھوڑو"۔
مَیں تمھارے سامنے رُک گیا تھا

جانتی ہو کیوں

کیوں کہ تمھارے بال اس آگ کی طرح تھے

جسے کوئی بھی ہوا بُجھا نہیں سکتی ہے

تمام جادُوؤں میں سب سے سادہ اس جادُو سے متاثر ہو کر

میں رُک گیا اور تمھاری پرستش کرنے لگا

---

آئیون دینیا

# خستگی

کھیتوں کی اُجڑی جوانی اور خزاں کی طرح
افسردگی مجھ میں سمائی ہوئی ہے
ایک بوسہ بھی میری رُوح تک نہیں پہنچتا ہے
ایک برف پارہ بھی اس زمین کو نہیں چھُوسکا ہے۔

## دُکھ کا گیت

سب سے زیادہ دُکھ بھرا گیت
کرفیو کے وقت
بےبسی اور کسمپرسی کے عالم میں
چڑیوں کی خشک چیخوں سے اُبھرتا ہے

یہ زندگی ہے جو دن بدن
لامحدود وسعتوں میں درد کی زنجیر بنتی چلی جاتی ہے
ان درختوں کے درمیان جو جنّت کے لیے اُگے ہیں
ان پانیوں کے درمیان جو صرف اپنی سطح تک مقید ہیں
ان کلّوں اور ریوڑوں کے درمیان جو چراگاہ تک محدود ہیں
ان پتّیوں کے درمیان جو ہَوا کے دوش پہ بکھر جائیں گی
زندگی درد کی زنجیر بنتی چلی جاتی ہے

الفلیپیڈ

# بے تعلّقی کی جلاوطنی

وہ میرے پاس دماغ کی جھلّی چھوڑ گئے ہیں
تاکہ مَیں اپنے آپ کو اکٹھا رکھ سکوں
اور اب پٹیوں میں بندھا، سوجن سے بے حال۔
مَیں سٹریچر پر زندگی اور مَوت کے درمیان
لیٹا ہُوا ہوں
انھوں نے نازک وریدوں کو ربڑ کے دِل میں گرمایا
مجھے فولادی پھیپھڑے دیے
میرے اندر کسی اور کا خُون جاری کیا
اور یوں مجھے زندگی بخشی۔
مَیں کانوں کے بغیر سُنتا ہوں اور بینائی کے بغیر دیکھتا ہوں

بالکل اسی طرح جیسے کٹے ہُوئے بازو میں بھی
کبھی کبھی نبض چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
مَیں اپنے اندر، اپنی ہی ایک نشانی کی طرح
زندہ ہوں۔
میری ساری زندگی
صرف خیال اور یاد ہے
خون کے لاکھوں ذرّات ابھی زندہ ہوں
کے سندیسے بھیج رہے ہیں
آرزوؤں کو جگا رہے ہیں
اور وہ حکم دے رہے ہیں
جسے جسم کا کوئی عضو، مان نہیں سکتا ہے۔
مَیں لوہے کی تاروں اور سوئیوں سے سِلا ہُوا ہوں
سارے وقت میرے اندر بجلی کے جھٹکے
سرایت کرتے رہتے ہیں
اس جگہ کیسی عجیب تجارت فروغ پا رہی ہے۔
تم ہر طرح کا جتن کر لو

لیکن مجھے کبھی نہ سمجھ سکو گے ۔

تم اس طرح کے عجیب و غریب صفحے جمع کرتے رہو گے
جو اوپر چڑھتی اور نیچے گرتی سیہ لائنوں سے پُر ہوں گے
لیکن تم اس دماغی گراف کے حوالے سے
میرے خیال کی لو کو بھی نہ سمجھ سکو گے ۔
یہ سیہ لکیریں ان کا کیا مطلب ہے
صرف میں بتا سکتا ہوں ۔ لیکن کیسے
جبکہ ہمارے تمہارے درمیان، رابطے کی کوئی شکل نہیں ہے
اور میرا دماغ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا محسوس ہوتا ہے ۔
وہ لائنیں بے معنی ہیں
ان سے تم اتنا ہی بتا سکتے ہو
کہ میں ـــــ ابھی زندہ ہوں
ایک ناقابلِ یقین زندہ انسان
جو کہ آدھا مشین ہے اور آدھا زندہ شے کی طرح ہے
یہ کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن تمھیں اسی پر اکتفا کرنا پڑے گا

جب تک کہ تمھیں میری طرف سے کوئی پیغام ملے
تمھیں اک نئی دریافت کی ضرورت ہوگی
جو مشین کے بغیر بھی ہمیں ایک دوسرے سے
رابطہ قائم کرنے میں مدد دے گی۔
خیالات سے خیالات کا رابطہ
اور یوں مَیں
ذہنی وابستگی کی دُنیا میں آزادانہ گھوم سکوں گا
مگر جب تک، پُراسرار اور گنگ،
مَیں بے تعلّقی کی جلاوطنی میں رہوں گا

---

راڈ و بوریٹیو

# آواز

تمام رات دُنیا کے ناخن نے
یادوں کے بد رنگ آسمان کو کھُرچا ہے۔
مَیں زمین پر کھڑی ہوں
دُنیا نے مجھے فراموش ماضی کے دیاروں میں چھوڑ دیا ہے
میرا وجود ایک خالی ہتھیار خانے کی طرح ہے۔
مَیں ایک ویران چوٹی پر ایستادہ ہوں
جس کے دامن میں صرف فیکٹریاں چلتی ہیں۔
دیو قامت بھوری بِلّیاں
نتھنے پھُلاتی اور اپنے بالوں کو پھڑپھڑاتی
صحن میں گھوم رہی ہیں۔

جبکہ اینٹوں کی لمبی سیاہ اُنگلیاں
اَن دیکھے لبوں کو خاموش رہنے کا حکم دے رہی ہیں۔
مَیں ایک ویران چوٹی پر ایستادہ ہوں
وادی میں دُودھیا دھند پھیل رہی ہے
پُورا منظرِ ایک نیگیٹو کی طرح نظر آرہا ہے
جس میں صرف جھیل سفید نظر آرہی ہے
اور ساری فیکٹریوں کی چمنیاں دُھند سے مُنہ نکالے
سیاہ نظر آرہی ہیں۔
سُرخ جھیل کے کنارے بل کھاتے درخت ہیں
مَیں ابھی یہیں ہوں
سُورج آسمان پر ایسے چکّر لگا رہا ہے
جیسے کسی تہ خانے میں ایک ٹارچ!
اور زمین گونجتی ہے
میری آواز سے جو بھاری آواز کے سہارے
لہر بہ لہر پھیلتی ہے۔
وقت، بسترِ استراحت کی جانب پلٹتا ہے

آنکھ، روشنی کو بلاٹنگ پیپر کی طرح جذب کرتی ہے
مَیں نے آسمان کی بے داغ اور پُر اسرار پنہائی میں
آوارہ خرامی کرتے ہوئے کچھ نہیں کھویا
تمام شب، بیکار اشارے اور پاگل آسمان
میرے ہم رکاب رہے ہیں
اب مجھے اپنی چیخ کے جواب میں ایک چیخ سُنائی دی ہے
ایک بار، پھر دوبارہ
اس سنّاٹے میں تمھارا یہ جواب
محبّت کی ایک نشانی ہے۔

ویرد نیکا ورم باکو

# مَیں کُچھ نہیں ہُوں ۔ تم کون ہو

مَیں لفظوں سے خوفزدہ ہُوں
کہ دن انھیں بوسیدہ کر دیتا ہے
مَیں بغیر لفظوں کے خوفزدہ ہوں
کہ یہ رات کے جبر سے نجات دلا سکتے ہیں
مَیں آئینوں سے خوفزدہ ہوں
کہ وہاں سوائے میرے عکس کے اور کُچھ نہیں ہے
مَیں بغیر آئینوں کے خوفزدہ ہوں
ڈرتی ہوں کہ کہیں انسانوں کی عادت ہی نہ کھو بیٹھوں
مَیں سونے سے خوفزدہ ہوں
سانپ دروازے کے باہر میری تاک میں ہے

مَیں جاگنے سے خوفزدہ ہوں

دروازے سے آگے، خلا، میرے انتظار میں ہے

مَیں زندہ رہنے سے خوفزدہ ہوں

مجھے اپنے پیروں کے نیچے زمین محسوس نہیں ہوتی ہے

مَیں مرجانے سے خوفزدہ ہوں

زمین میری چھاتی پر آن گرے گی۔

سٹیفان آگسٹن ڈوٹیناس

# آج ہم جُدا ہوتے ہیں

اب ہم نہیں گائیں گے ۔ اب ہم نہیں مُسکرائیں گے
آج اِک نئے موسم اور اس کے نئے احساس کی ابتدا ہے
آج ہم جُدا ہوتے ہیں
ایسے جُدا ہوتے ہیں جیسے زمین اور پانی
جُدا ۔ جُدا ہوتے ہیں
ہماری خامشی کا ہر اظہار بالکل قدرتی ہے
ہم ایک دوسرے سے کہتے ہیں
"یہ اس طرح ہونا چاہیے"
قریب ہی ایک نیلا سایہ
ہمارے ذہنوں کی سچائی اور صداقت کی تائید کرنے کے لیے

بطور شاہد ، موجود ہے

بہت جلد، تم سمندروں کی نیلاہٹوں جیسی ہو گی

اور مَیں زمین کے سارے گناہوں کے ساتھ

زمین جیسا :

بڑے بڑے پرندے تمھیں آسمانوں میں تلاش کریں گے

اپنی چونچوں میں وہ تمھارے لیے خوراک اور خوشبوئیں بھر بھر لائیں گے

لوگ سوچیں گے

ہم دشمن ہیں

ہمارے درمیان دُنیا ٹھہر جانے گی ،

صدیوں پُرانے جنگل کی طرح

جس میں دھاری دار فر والے خونخوار جانور رہتے ہیں ۔

کسی کو نہیں معلوم ہو گا کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں ۔

ہر شام میری رُوح

پانی کے بہاؤ سے کٹے ساحل کی طرح

تمھارے جسم میں متشکل ہو جاتی ہے

آج ہم نے ایک دوسرے کو چومتے ہیں

نہ ایک دوسرے کے لیے فکرمند ہوتے ہیں

ہم تو ایک دوسرے کی خواہش بھی نہیں کرتے ہیں

اک نئے موسم اور اس کے احساس کی ابتدا ہے

آج ہم جُدا ہوتے ہیں

ایسے جُدا ہوتے ہیں

ایسے جُدا ہوتے ہیں، جیسے زمین اور پانی جُدا، جُدا ہوتے ہیں

تم بہت جلد، آسمان کا ایک عکس بن جاؤ گی

مَیں کالا سُورج اور زمین بنوں گا

جلد ہی ہَوا اُٹھے گی

ہَوا بہت جلد اُٹھے گی!

نینا کسان

# سیلف پورٹریٹ

میں کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر دں
میں ہمیشہ وہی رہوں گی جو کہ میں ہُوں۔
میں اپنے چہرے کو کبھی گول نہیں بنا سکوں گی
میں اپنی آنکھوں کو بادام جیسا
اور اپنی ناک کو تیکھا نہ بنا سکوں گی۔
میں کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں
میں اپنی کھوپڑی کی شکل بدل نہیں سکوں گی
کیونکہ یہی عجیب وغریب حُلیہ اور تکون چہرہ
جو کہ کبھی کبھی میٹھی ڈبل روٹی کی طرح محسوس ہوتا ہے
اور کبھی قزاقی کشتی کے اگلے سرے جیسا

یہی میرا مقدّر ہے۔

یہ میرے لمبے بال ہمیشہ یونہی
دُھوئیں کے رنگ کی طرح رہیں گے۔

یہ میرا مقدّر ہے کہ مَیں دن رات
مسلسل اسی حُلیے کو برقرار رکھوں۔
جب میری بدہیئتی کی تصویر دیواروں پر واضح ہو جائے
تو مَیں اپنے اردگرد موجود لوگوں کی بصارت کو زخمی کر دوں۔
میرا رشتہ کس سے ہے
مرے والدین، ننھیال ددھیال
سب نے مُجھ سے ناطہ توڑ لیا ہے
اور یوں لگتا ہے کہ کالی بھوری
پیلی اور سُرخ، سب نسلوں نے
وقتی طور پر اس مسئلے پر ایکا کر لیا ہے۔
کوئی بھی جاندار
مجھے اپنے سے متعلّق کہنے اور پہچاننے سے منکر ہے
جب مَیں خود کو زخمی کر کے روتی ہوں

جب یخ بستگی میری رگوں کو بھی چھلنی کر دیتی ہے
جب وقت میرے اوپر اک گہرے زخم کا نشان چھوڑ جاتا ہے
تو وہ کہتے ہیں "خوبصورت"
لیکن میں کہتی ہوں "آدم زاد"

---

آئیون بورا

# تمھارے لیے

تمھارے پاس ہر چیز کے لیے وقت ہے
تم اَن تھک اور بے پناہ ہو
تم سخت سے سخت کام آرام سے کر لیتی ہو
خوشی اور افسردگی میں
روز و شب، تم ہمیشہ میرے پاس ہو
سوتے ہُوئے، خوابوں میں
ہجوم میں۔ تنہا،
تمھارے پاس ہر چیز کے لیے وقت ہے
کھڑے ہو کر میرے بالوں میں کنگھی کرنے کا
کتابوں کے ضخیم انبار میں غوطہ زن ہو کر

مضمون، نظمیں اور نوٹس بنانے کا
امتحانوں کے پرچے دیکھنے، پڑھنے،
لیبارٹری میں کام کرنے کا
سینکڑوں موجود بچّوں میں ہر بچّے پر توجہ دینے کا،
جن کی خود نوشت سرگزشتوں کا
ایک صفحہ، ہر روز تم ہی تو تحریر کرتی ہو۔
کتابوں سے پُر کتابوں کی شیلفوں کے ساتھ
ہماری چھوٹی بیٹی
خواب آلود آنکھوں سے
تم سے سنو وائٹ اور سات مہربان بونوں کی کہانی سُن رہی ہے۔
تمھارے پاس ہر چیز کے لیے وقت ہے
جب اپنے فارمولوں کے ساتھ
اپنے اگلے ہفتے کے آنے والے اسباق کی
اَن تھک اور بے پناہ تیاری کر رہی ہوتی ہو
تو یہی زندگی کی اصل روح لگتی ہے۔

بتیر یوا تان

# تلوار اور پھول

جب میرا بچہ پیدا ہوگا

تو بہت جلد

سرسبز میدانوں اور لمبے تنے کے درختوں کو جان لے گا

وہ اپنے ہاتھ شبنم سے بھیگی ہوئی

گھاس کی پتی کی جانب بڑھائے گا

وہ شیشے کے ذریعے دروازے کے اندر

جھانکتی ہوئی روشنی کی شعاعوں کو

پکڑنے کی کوشش کرے گا

اپنے تلووں کے نیچے مٹی کی گرمی

محسوس کرکے وہ بستر سے زیادہ سکون

اور گرمی پائے گا
وہ اس مُلک کی مٹی سے پیار کرے گا
سُورج، نرگس اور ان کے گیتوں سے پیار کرے گا
وہ سیاروں کے بُلاوے کو محسوس کرے گا
اور اسے پَر ملیں گے جن کی قوّت سے وہ بادام سے بڑے
سیاروں کی جانب بھی مائل پرواز ہو گا جو بہت قدیم ہوں گے
مگر قمریوں کے وجود کے بعد کے دَور سے متعلق ہوں گے
وہ ان افقوں اور ان مُنتہاؤں کی جانب
مائل پرواز ہو گا جہاں خیالات تلوار کی طرح تھے مگر اب وہی خیالات
پھُولوں کی طرح لہک رہے ہیں۔

# افاقہ

دیکھو مَیں واپس آگیا ہوں

اب ہم ایک دوسرے کو پیار کریں گے

اب ہم ایسے زندگی گُزاریں گے

جیسے پہاڑ ، برف کے نیچے

اور سنہری لہریں ، اگست کے جلتے موسم میں۔

اب مَیں خوش ہوں کہ مجھے

دل کا بہت خیال نہیں رکھنا پڑتا ہے

اب یہ پہلے کی طرح حسبِ معمول کام کر رہا ہے

یہ مجھے کوئی تکلیف نہیں دیتا ہے

اب یہ پہلے کی طرح ، خون جمع کرتا ہے

پھر اسے سارے بدن میں پھینک دیتا ہے
اور یوں، دماغ اور اُنگلیوں کو زندگی دیتا ہے
مَیں اب خوف اور مَوت کی دسترس سے باہر ہوں
اس برف پر، میرے پاس ایک پنسل ہے
جس سے مَیں اپنی نوٹ بُک کے صفحات لکھوں گا
جنگل میں اِک بھُوری چِڑیا گا رہی ہے
مگر یہاں کوئی اور خوبصورت اداس چڑیا نہیں ہے
جو لمبے تنے کے درختوں سے، اس کو جواب دے سکے۔

نکولائی لیبس

# مگر ہم نہیں

ہم میں سے کچھ لوگ اپنی غلطیوں، مکر اور خوف پر غالب آ گئے ہیں
مگر ابھی بھی افق پر لٹکے ہوئے نخلستان تک پہنچنے کے لیے
کافی طویل مسافت طے کرنی باقی ہے
سوکھی ہوئی نسلیں بالکل ہی سُوکھ جایا کرتی ہیں
نوجوان نسل ستاروں کو دیکھ کر ہنسا کرتی ہے۔
ان بدلتے ہُوئے راستوں پہ
وہ کون پہلا شخص ہو گا
جو کامیابی کے خوابوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دے گا۔
ہم میں سے کون ہمارے جسم کے مُردہ ہونے سے پہلے ہی مر جائے گا۔
ہم میں سے کون اپنا دل ریت میں گرا دے گا۔

کیونکہ اتنا بھاری بوجھ لے کر وہ چل نہیں سکتا ہے۔
بُری خبر اور بے عزّتی کی طرح
یہ سوال بار بار ذہن سے ٹکراتا ہے

سنو۔ سنو۔ سنو
مگر ہم نہیں، کبھی بھی ہم نہیں۔۔۔

---

نیچیتا سٹینسکیو

# دوسرا نوحہ

ہر کھوکھلی جگہ پر ایک خُدا موجود تھا
اگر کسی پتھر میں کہیں دراڑ سے جگہ پیدا ہو گئی
وہ بھاگے اور ایک خُدا اس میں بٹھا دیا
اگر کوئی پُل گرا تو یہ حادثہ، خُدا کے نزول کے لیے کافی تھا
جہاں کہیں سڑک میں دراڑ پڑی
تو خُدا کا ظہور اور وجود، اِک لازمہ تھا
محتاط رہو، اپنے ہاتھ اور اپنی ٹانگیں
جان بُوجھ کر یا غلطی سے زخمی نہ کر لینا
ورنہ وہ تمھارے زخم میں بھی اک خدا لا بٹھائیں گے
جیسا کہ اُنھوں نے ہر جگہ کیا

وہ اِک خُدا بٹھا دیتے ہیں

اور ہمیں اس خُدا کی عبادت کی ترغیب دیتے ہیں

کیونکہ ان کے خیال میں وہ خُدا

ان تمام چیزوں کی حفاظت کرتا ہے جو ٹوٹ کر بکھرنے والی ہوتی ہیں۔

سپاہی! اس کی نگرانی کرو

پلک بھی جھپکنے نہ پائے

ورنہ یہ لوگ اک خدا لاکر، بندوق کی نالی پر بٹھا دیں گے

اور وہ وہاں جم کر بیٹھ جائے گا

ہم اس کی تعریف و توصیف میں بے خود ہوں گے

اور آخر

ہم اپنی روح و بدن اس کی حمد و ثنا میں خاک کر دیں گے۔

مارن سوریسکو

# وراثت

کھڑکی سے باہر جھانکنا
ہم سب کی عادت بن چکی ہے
ہر شخص کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے
پڑھتے ہوئے ، نہاتے ہوئے ، پیار کرتے اور مرتے ہوئے۔
ہر عالم میں
ہم افتاں و خیزاں ، کھڑکی سے
باہر کا نظارہ دیکھنے کو بے تاب ہوتے ہیں۔
تم آخر کیا دیکھنے کے تمنائی ہو
تم بھلا کس کو ڈھونڈھ رہے ہو
بھول جاؤ

جو آچکا ہے ۔ وہ آچکا ہے
جو جا چکا ہے
وہ بس ۔ جا چکا ہے
جو کچھ تمھارے ساتھ ہونا تھا
وہ سب کچھ ہو چکا ہے
پردے کھول دو
کھڑکیاں بند کر دو
اور آرام کرو
بارش ۔ دھوپ ، جنگ ، امن
گویا ہر ابتلا اور آسائش
بار ، بار دیکھ لینے کے بعد
تم نے محسوس کیا
کہ ہر غم اور ہر خوشی ، بغیر کسی تبدیلی کے
ایک وقت کے بعد دوسری مرتبہ
اپنے آپ کو یونہی دُہرائے جا رہی ہے
انسانیت

در اصل کچھ اور دیکھنا چاہتی ہے
مگر جو کچھ ہے، اسے دیکھنے کے لیے
بے نور آنکھوں کے ساتھ، کھڑکی میں
ایستادہ ہے

---

اینا بلینڈیانہ

# اس لمحے

یہ وہ لمحہ ہے جبکہ وحشی درندوں کا پیار
اپنے سے چھوٹوں کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے
عورتوں کو بچّوں کی پیدائش کے مرحلے میں
مر ہی جانا چاہیے
تبھی دُنیا میں، ہر چیز خوبصورت ہوگی
عورتوں کے کُولھے، جب دردِ زہ کے عالم میں پھیلیں گے
تو اسی کے درمیان سے دُنیا کا امن اُبھرے گا
بھاری چھاتیوں کے درمیان، سانپ پھسل پھسل کر
ان پہ پھینکی ہوئی گرد اور مٹی کو نرمی سے صاف کریں گے
پھل اس زمین کی گہرائیوں میں اُگیں گے

جو دُودھ کے ذرّے سے خمیر شدہ ہو۔
ہر چیز بہت خوبصورت ہوگی
مریم نما، باوقار عورتیں
دوسرے اجزا سے ملنے کے لیے
نیچے کی جانب، مُسکراتی ہوئی جائیں گی۔
مگر یوں ہوتا نہیں ہے

عورتیں بچّوں کی پیدائش میں
اس طرح نہیں مرتی ہیں
جس طرح ہیملیٹ نے، بادشاہ کو عبادت کے دوران
اس خوف سے نہیں مارا تھا
کہ وہ بادشاہ جو عبادت کے دوران مارا جائے
جنّت میں داخل نہیں ہو سکتا ہے

---

# بلغاریہ کے شاعر

## <u>لیوڈل سٹونیوف :</u>

پیدائش ۱۸۸۶ء ، وفات ۱۹۷۳ء

شاعری ، ڈرامہ ، تنقید ، ترجمہ ، ہر صنفِ سخن میں بہترین تخلیقات پیش کیں۔ ان کی تخلیقات جدید بلغارین ادب میں کلاسیکی حیثیت رکھتی ہے

## <u>نکولا فورناڈجیو :</u>

پیدائش ۱۹۰۳ء ، وفات ۱۹۶۸ء

## <u>الیگزینڈر گروف :</u>

پیدائش ۱۹۱۹ء ۔ ابھی حیات ہیں۔

جدید بلغارین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔

## <u>بلاڈاڈومٹروف :</u>

پیدائش ۱۹۲۲ء ، ابھی حیات ہیں۔

## <u>راڈیورالن :</u>

پیدائش ۱۹۲۳ء ، ابھی حیات ہیں۔

**لیانا دسکالووا :**

پیدائش ۱۹۲۷ء

**پوروان سٹیفانوف :**

پیدائش ۱۹۲۱ء ، حیات ہیں

**ولاڈیمیر باشو :**

پیدائش ۱۹۳۵ء ، وفات ۱۹۶۷ء

**پینیو پینوف :**

پیدائش ۱۹۳۰ء ، وفات ۱۹۵۹ء

لیوڈمل سسٹونیون

# پہلی مُلاقات

جوانی میں، مَیں آزادانہ ، دُور دُور تک گھُوما ہُوں
ایک دن ، صُبح ، مَوت نے مجھے پکڑ لیا۔
ایک خنجرِ بُرّاں اس کے کندھے پر لٹک رہا تھا۔
مگر اس دن مَوت نے بھی مجھے ، بس ایک نظر دیکھا۔
اے تیغ بکف ! کیا تم مجھے ساتھ نہیں لے جاؤ گی
تم بھی تو ساری رات شکار کی تلاش میں سرگرداں رہی ہو گی۔
مگر آنکھوں میں تیخ آلود تمسخر لیے
بے اعتنائی سے مُڑ کے دیکھے بغیر
وہ چُپ چاپ گزر گئی
وہ اس وقت میرے پاس سے لے کر بھی کیا جا سکتی تھی۔

میرے پاس نہ کوئی دولت تھی اور نہ مادّی خزینہ
جس کے لُٹ جانے پہ مَیں ماتم کناں ہوتا۔
خزانے تو میرے مستقبل میں پنہاں ہیں
اور اس خزانے پر کسی انسان کا بس نہیں چلتا ہے

اس لیے مَوت کو مُجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی
اور وہ آگے چلی گئی
اپنے چند ہم عصروں کی طرح
مجھے جنگ، شہرت اور طاقت میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی
میں نے مَوت کا تمسخر اُڑایا
اُور موت سانس کی طرح ہَوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئی
بہت سال بیت گئے
میرے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں
اور مَیں لفظوں کے انبار جمع کر چُکا ہوں۔
مگر کیا ان دولتوں کو چھین لینے کی
مَوت کوشش کرے گی، اگر وہ پھر میرے پاس سے گزرے؟

جس طرح کُتّے کو پرے رکھنے کے لیے گوشت پھینک دیا جاتا ہے
مَیں آج مَوت کے سامنے کیا پھینکوں
جو نقصان مجھے بے تحاشا تکلیف کے ساتھ برداشت کرنا پڑے گا
وہ میرا ماضی ہو گا۔ جو پھر کبھی بھی واپس نہیں آسکتا ہے۔

---

نکولا فورناڈجیو

# ہم اکٹھے ہیں

خوشی ہو یا غم، ہم دونوں اکٹھے رہے ہیں
خوشی — بہت جلد بیت جاتی ہے
مگر مجھے معلوم ہے کہ زندگی میں تم نے کس قدر محرومی محسوس کی ہے
جب گہرے غم نے ہماری زندگی میں جگہ پائی ہے
بے پناہ مصائب کے ان برسوں میں
تم نے زندگی کی کشتی رواں رکھنے کے لیے ہمیشہ حوصلے سے کام لیا ہے۔
تم نے میری جدوجہد کو سراہا
اور میرے خوابوں کو اپنی زندگی سمجھا
غم و اندوہ کا یہ زمانہ کتنا شدید تھا۔
اور جب صدمات پہاڑ بن کر گرے

اور تمام راستے مسدود ہو گئے
اس وقت مجھے لازوال طاقت کی ضرورت تھی
تمھارا بے پناہ شکریہ کہ تمھاری رفاقت ہی میری لازوال قوت تھی۔
سُورج بہرحال ڈوب جاتا ہے
اور ہمیں معلوم ہے کہ سورج ہمارے لیے نہیں رُکے گا۔
ہم زندگی کے تمام مدّوجزر سے واقف ہیں
ہم نے اُمید اور آلام کے ذائقوں کو بھی چکھا ہے۔
اب ہرچند زندگی کی کشتی کنارے کی جانب آرہی ہے
دو شفاف چشمے ساتھ ساتھ مگر اپنے اپنے مقام پر رواں ہیں
اب ہماری منزلیں ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہی ہیں
مَیں تمھارے ساتھ ہوں۔
اندوہناک دنوں کو مت یاد کرو۔

---

ایلگزینڈر گروٹ

# کبوتر

سب سے خوبصورت کبوتری
آج صبح صبح مر گئی۔
میں نے اس کے ٹھنڈے اور مردار جسم کو اٹھایا
اور یخ زمین میں دبا دیا۔
کبوتر تنہا ہو کر
بادلوں سے اوپر، دوسرے کبوتروں کے ساتھ اڑنے لگا۔
صبح کی روشنی میں اس کے پر گرتی پتیوں کی طرح کی آواز پیدا کر رہے تھے۔
اور پھر وہ سب سے الگ، سب سے جدا تھا
اس کا غم شدید اور بے پناہ تھا۔
اس کی غمناک آواز

آنے والی موت کا نوحہ بنی ہوئی تھی

ہماری زندگیاں بھی یونہی ختم ہو جاتی ہیں
ہم بھی یونہی تنہا رہ جاتے ہیں
مگر ہمارے پاس اُڑنے کے لیے پَر نہیں ہوتے ہیں۔
ہم درد کی شدّت سے مضطرب زندہ رہنے پر مجبُور ہیں

---

بلاڈا اُڈمٹرف

# تنِ تنہا سفر کرتی عورت

یہ ایک جان جوکھم مسئلہ ہے
ایک بے چینی ہے۔
اس دُنیا میں۔ جو آج بھی مرد کی دُنیا ہے۔
تمھارے کام کے بدلے
بدتمیز اور بے ہودہ جملوں کی کمین گاہیں
تمھاری منتظر ہوں گی۔
گلیوں، سڑکوں اور بھرے پُرے چوراہوں میں
بُری نظریں، گھورتی اور کنکھیوں سے دیکھتی آنکھیں
تمھارے اردگرد ہوں گی۔
ایک تنہا سفر کرتی عورت

تمھاری ساری خود حفاظتی
تمھارا نہتّا پن ہے۔
تم آج تک کسی مرد کو
ایک مضبُوط سہارا جس پر تم جُھک سکو
ایک مضبوط تنا، جس کے سہارے تم آرام کرسکو
ایک دیوار جس کے سائے میں تم رہ سکو
نہ بنا سکی ہو۔
تم نے ایک مرد کو بھی
راہِ منزل یا جستِ منزل نہیں سمجھا ہے۔
تم نے تنِ تنہا سفر کا آغاز کیا
تاکہ مرد کو برابر کی سطح پہ ملو
اور یوں صحیح اور سچّے پیار کی بنا پڑے۔
تھیں نہیں معلوم کہ تم آگے جا بھی سکو گی
یا تم آدھے راستے میں مٹّی میں دھنس جاؤ گی
یا پھر سُورج کی تیز شعاعوں سے تمھاری آنکھیں چُندھیا جائیں گی
تمھیں ان سب باتوں کا اندازہ نہیں

مگر تم سرکش ہو ۔

کیونکہ اگر وہ تمھیں آدھے راستے میں ناکام بنانے کی بھی کوشش کریں

تمھارا جرأت مندانہ آغازِ سفر

اس بات کی دلیل ہے کہ تم کہیں نہ کہیں ضرور پہنچو گی ۔

سڑک پر ایک تنہا خاتون

تم آگے ہی آگے بڑھتی رہو ۔

تم مت رُکو ۔

کوئی مرد ایسا تنہا نہیں ہو گا

جیسا کہ سفر کرتی ہوئی تنہا عورت ۔

تمھارے سامنے تاریکی

سات تالوں والا دروازہ کھڑا کر دیتی ہے ۔

ایک عورت تنہا سفر کا آغاز

رات کو نہیں کرتی ہے ۔

اور ایک گھمانے والی چابی کی طرح

درخشاں سُورج

صُبح کے وقت سارے دروازوں کے تالے کھول دیتا ہے

مگر تم اندھیرے میں بھی

چھپتے چھپاتے نہیں، آزادی کے ساتھ چلو۔

تمھارا ہر قدم اعتماد اور یقین کی علامت بن کر اُٹھے۔

اور اس مبہم مرد کو جھٹلا دے

جس نے تمھیں اکثر خوفزدہ کیا ہے

فرش پر تمھارے قدموں کی آواز کی گونج پھیلتی ہے

ایک تنہا سفر کرتی عورت

سب سے نرم مگر سب سے باعزم قدم

ہماری اس ملائم سرزمین پر

جو بذاتِ خود

اس شاہراہ پر ایک تنہا عورت کی طرح ہے۔

اڈیور ارلن

# بیٹی

میری ماں
(مجھے یقین ہے کہ آپ نے اسے کبھی نہیں دیکھا)
بہت بدصورت عورت ہے۔
یہ بھی تو حقیقت کو کم کر کے بتانے والی بات ہے
ورنہ حقیقت میں تو وہ ہیبتناک ہے۔

جس دن وہ پیدا ہوئی
ایک کوہان نے اس کے جسم کو دبوچ لیا
اور ایسے مروڑا کہ جب وہ بڑی ہوئی
تو نہ سیدھی تھی اور نہ نازک

اس کا کوئی بچپن نہ تھا
اس کے ساتھ بچّے نہیں کھیلتے تھے
اور اس کی ماں ملامت کرتے ہوئے کہتی
کاش تم پیدا ہی نہ ہوتیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا
کہ جب وہ بڑی ہوتی ہوگی
تو کیا لگتی ہوگی
بھینگی آنکھوں اور تشنج زدہ بوکھلائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ
کونسی لڑکی اپنی جوانی تباہ کرنے کے لیے
اس کا ساتھ گوارا کرتی ہوگی
شاید اسی لیے میری ماں کبھی محفل میں دکھائی نہیں دی

مگر اس سرزمین پر میرا باپ کہاں سے آگیا
اس بدذوق اور فضول آدمی کو
میری ماں کی آخر کونسی چیز پسند آئی

اسے آخر کس ادا نے مسحور کیا
اس کے پاس نہ تو جہیز تھا۔ نہ سونا اور نہ گھربار۔

کیا یہ محبت تھی
تو کیا ہمدردی تھی
بہرحال مہربانی کا عنصر ضرور غالب تھا
ورنہ مَیں، یوں مسکراتی، صحیح سالم اور نرم و نازک
پیدا نہ ہوتی۔

ہر شخص یہ کہتا ہے کہ مَیں
سارے علاقے میں سب سے خوبصورت لڑکی ہوں
یہ ممکن ہے داستان طرازی ہو
مگر یہ حقیقت ہے کہ مَیں خوبصورت ہوں

میری ماں، میرے ساتھ
ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے

باہر سیر کو نکلنا
پسند کرتی ہے
اور جو بھی راستے میں ملے
اسے سلام کرنا
پسند کرتی ہے۔

لیانا وسکالووا

# قرمزی رنگ میں ایک نظم

قرمزی رنگ
میرا پسندیدہ رنگ ہے
میرا کوٹ بھی قرمزی ہے
اور میرا لباس بھی

جب تم مجھے گلے لگاؤ
ذرا سلیقے سے لگانا
کیونکہ تم ایک پھولدار شاخ گلے لگاؤ گے

تمھاری محتاط نگہداشت سے

میرا دل کانپ کانپ اُٹھتا ہے
جیسے کہ ایک پھُول کی پتّی
میرے لباس کے نیچے کانپ اُٹھے
اور یہ دل نما پتّی
اُڑ کے کہیں گر بھی سکتی ہے
اگر کسی پُر آشوب دن
کوئی طوفان آئے تو ،

میرے ہمدم یہ نہ بھُولنا
کہ یہ پھُولدار شاخ
نہ تو پھُولوں کی ہے
اور نہ درخت کی ہے ۔

یہ تو پھُول کی طرح نازک ہے
اور درخت کی طرح پُر غرور
اگر شاعروں کے سر پہ تاج ہو

تو یہ میرے سر کا تاج ہوگی ۔

کیا تمھیں میرے عشق کا اندازہ ہے
کہ مجھے قرمزی رنگ کیوں پسند ہے
میرے کوٹ کا رنگ
اور میرے لباس کا رنگ قرمزی کیوں ہے،

کیونکہ قرمزی رنگ
سرخ اور نیلا رنگ مل کر بنتا ہے
یہ انقلاب اور امن کے رنگ ہیں ۔

پوروان سٹیفاتوف

# سوالات

بابو! یہ چڑیاں ننگے پاؤں کیوں پھرتی ہیں
بابو! یہ درخت ہوا کو کیوں چلاتے ہیں
کیوں ۔ کیوں ۔ کیوں
تم مجھے کیوں پریشان کرتی ہو
کیا تم اچھی بچّی نہیں بن سکتی ہو
مگر نہیں ۔ یوں نہیں ۔
کیا میں اپنی بچّی کو بھی
بدقسمتی کی بشارت دے رہا ہوں،
میری بچّی مجھے معاف کر دو
میں ـــــ ہاں بس مجھے معاف کر دو

اب تم اپنے سوال دُہراؤ
اور دوسرے ذہنوں کو تکلیف دو۔
لیکن کل تم سوالوں کی صلیب پہ
خود لٹکی ہوئی ہوگی
اور تم پھر اس وقت کو بہت مشکل
ناخوشگوار اور ناقابلِ برداشت
تصوّر کروگی
مَیں تمھیں اس وقت سے بچانا چاہتا تھا۔
یہی سبق تھا جو ہمارے اجداد نے ہمیں دیا
انھوں نے ہماری گوشمالی کی اور زباں بندی کی
حتّیٰ کہ ہم ان کی دانش کی بنیاد کو سمجھنے لگے۔
جب ہم نے سوالات کرنے بند کردیے
تو ہمارے بزرگوں نے سکون کا سانس لیا
لیکن مَیں تمھارے لیے اس نصیب کی تمنّا نہیں کرسکتا ہوں
پوچھو تم اپنے سوالات ضرور پُوچھو
بہت اچھی بچّی مت بنو

ہر ایک سے پوچھو

چڑیوں سے پوچھو

اپنے خوابوں سے پوچھو

اپنی ہتھیلی پہ کھیلتے ریشم کے کیڑوں سے پوچھو

سوالوں کی یہ جوالا

اللہ نہ کرے کہ تمھارے ہونٹوں پہ خاکستر ہو جائے ۔

ولاڈیمیر باشو

# سایہ

اگر ہمیں دُنیا کو کچھ نہیں دینا
تو پھر ہم کیوں پیدا ہُوئے تھے۔
ہمیں وہ عزّت نہیں چاہیے
جو بڑے آدمیوں کے ناموں کو سجاتی ہے۔
ہمیں تو عورتوں کا وہ ذہنِ رسا چاہیے
جو دھاگے اور موتیوں کے ملاپ سے
ہماری زمین کا حُسن نکھارتی ہیں۔
ہمیں تو ان ہاتھوں کا رُوپ چاہیے
جو لکڑی کے سخت اور بے جان ٹکڑوں کو زندگی دیتے ہیں،
ہمیں وہ شان و شوکت نہیں چاہیے

جو بڑے آدمیوں کا حصّہ تھی
ایک نسل کا تشکّر ہمارے لیے کافی ہے۔
ہمیں کو لیو فچے جیسے معمار کی ضرورت ہے
جس کے خاموش اور بے جان پتھّر
ہمارے دلوں کو خوشی سے بھر دیتے تھے
ہمیں ماسٹر مینول کے ان پروں کی ضرورت ہے
جو آواز سے بھی تیز اُڑنے کی سکت رکھتے تھے۔
اور جو بلقان پہ اُڑنے والے
عقابوں سے بھی زیادہ حوصلہ مند ہوں۔
ایک نسل کا تشکّر ہمارے لیے کافی ہے
اسی لیے ہم اپنے ایک عظیم خواب کو
تخلیق کا رُوپ دینا چاہتے ہیں
گندم کے کھیت پہ برستے پانی کی طرح بنو
تازہ اور لذیذ روٹی کے ٹکڑے کی طرح بنو
جو گرفتارِ بلا ہیں، انھیں ہم درد سے چھڑانا چاہتے ہیں
بنجر زمینوں کو قابل کاشت بناؤ

سب جراثیم کو مار ڈالو
اور ننھے سے ایٹم سے
لاکھوں کروڑوں روشنیاں منقش کردو۔
آؤ عظیم خواب کو تخلیق کا رُوپ دیں
اور پھر جب ہم مریں
تو پھر ہمیں زمین میں بڑے آدمیوں
کے ساتھ ، دفن ہونے کا حق حاصل ہوگا

---

پینیو پینوت

(طویل نظم کا ایک حصہ)

# آزمائش کے دِن

اس مصیبت میں میرا دل دُکھ رہا ہے۔
میرا دل گئے زمانوں کی غلطیوں اور پاداشوں سے آگاہ ہے
اور اب خزاں کی پہلی یورش کی یخ بستگی
میرے بالوں میں سفیدی کا زخم آویزاں کر گئی ہے۔

گزشتہ شب کی خمریات کا تلخ ذائقہ ابھی تک
میرے ہونٹوں پر ہے
یہ ذائقہ چپکا رہتا ہے کہ گزُر جاتا ہے
میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں
وقت تیزی سے گزُر جاتا ہے

ہم تو اس کی رسّی سے بندھے ہیں
ہر تازہ زخم پر جلد ہی کھرنڈ کی تہ جم جاتی ہے

مگر مجھے ایک بات معلوم ہے
ہر زخم اپنا نشاں ضرور چھوڑتا ہے
میرے شعور کی دیوار اور بلند ہو گئی ہے
میرے اندر دو زمانے مدِّ مقابل ہیں
اور میرے اندر ہی ان دونوں زمانوں کی رستخیز باری ہے
کیا مَیں ہی صرف وہ بے قرار طوفان تھا جو تھما نہ تھا
کیا مَیں ہی صرف وہ بے چَین شخص تھا جو بجلی کی چمک سے متحیّر تھا۔

پھر بھی مَیں یہ کہوں گا کہ مَیں اکیلا فرد تھا۔
جس کے دل میں سوال وحشی ہرنوں کی طرح چوکڑیاں بھر رہے تھے

میرے اوسان گھڑی کی سوئیوں اور شب و روز کے چکر سے بندھے ہیں۔
سب کی ذمّہ داری کا فرض، میرے کندھوں پر ہے

میں نے خود ہی اپنی ذمہ داریوں کی گٹھریوں کو بڑھایا ہے
آج ہر مصرعہ جو میں لکھتا ہوں
ایک سخت سلاخ کی طرح میرے اندر نوکیلے زخم بناجاتا ہے
میرے خیالات پہرہ داری کرتے ہیں
کہ تم اپنے ماضی کی کس منزل پہ ایستادہ ہو !
میرے اوپر ایک سخت اور بیدرد زمانہ حاوی ہے
اس زمانے نے میری کوکھ میں گھر کرلیا ہے
اس زمانے نے میرے ماتھے پہ پنجے گاڑ دیے ہیں
میرے اردگرد ظالم لمحوں کی طنابیں کھینچ دی ہیں
ہنگامی لمحوں، اُبلتے سوالوں اور تشنج کر گرہیں،
گرہیں ہی گرہیں، موجود ہیں۔
میرے ماتھے کے پیچھے متضاد ہوائیں
کہ جن کو شکوک نے جنم دیا ہے، متصادم ہیں
وہ خوف زدہ ہو کر چیختی ہیں
اور میری گھسی پٹی مصروفیات کے انبار کو اٹھا کر پھینک دیتی ہیں
وہ چیختے چنگھاڑتے طوفانوں کو بھی بغاوت پر آمادہ کرتی ہیں

اور یوں گھرے سیہ بادل بارش بن کر برستے ہیں
اور میرے مندر پر بجلی بن کر چمکتے ہیں۔
ژالہ بار طوفان میری روح کے اندر اترتا جاتا ہے
میرے اکڑے ہوئے اعصاب پرنئے اطوار ستار کی تار کی طرح تنے ہوئے ہیں
اور بجلی میرے دماغ میں چُبھتی جاتی ہے۔
بھاڑ میں جائے یہ انا کا تماشہ
یہ شور و غل اور تصنّعات
مَیں اس دُنیا میں تعیشات اور رنگ رلیوں کے لیے نہیں آیا۔
وقت کا فولادی پہیا چلتا چلا جا رہا ہے
میں دن کے گھسے ہُوئے سخت پتّھروں کو توڑتا ہوں
میرے شعور کے نئے نظام کی طنابیں کمزور پڑتی جارہی ہیں
لالچ کے افیمی دروازے میرے لیے نہیں ہیں۔
اس وقت جب کہ انسانیت فریاد کناں ہیں
اور مصیبت کے ان دنوں میں ہاتھوں نے ڈائنا مائٹ پکڑے ہوئے ہیں
مَیں اس دُنیا میں
سُورج کو دیکھنے، خوشی کے اثمار کو چھونے اور خوشگوار ماضی بنانے کے لیے آیا تھا۔

میری انتہائی نظم

ذرا آزاد روی سے ، نظم معریٰ کی شکل میں لکھی گئی ہے ۔

تم ، زمانہ —— تم اور مَیں
ہمارے سُر نہیں مِلتے
مگر پھر بھی ایک سُر مشترک ہے
جس کا لُطف ہم سب اُٹھاتے ہیں ۔
ہم کافی مُدّت سے کُشتی لڑ رہے ہیں
کافی مُدّت سے مَیں یہ قمیص پہنے ہُوئے ہوں
میری جانفشانی کے نمکیں پسینوں میں بھیگی ہوئی یہ قمیص
دھوپ اور کُہر کے تواتر سے اب مٹیالی سی ہو گئی ہے ۔

مَیں دراز بازوؤں اور کھُلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مروں گا
اور مَوت کے بعد
سفیدیٔ صُبح کی جانب پلٹ کر
میری آنکھیں دیکھیں گی
دیکھتی رہیں گی حتّٰی کہ ،

میری روح بھی بیدار ہو جائے گی
اور پھر پہاڑی کی سمت سیدھی شاہراہ پر گامزن ہو گی۔
لاکھوں کروڑوں لوگوں کی آخری منزل
تمام مزاحمتوں کے کھُرنڈ کے اوپر سے گزر جائے گی۔
مَیں پھر آگے آگے طبل بجانے والا بنوں گا
اپنے مُلک کے آگے بڑھتے ہُوئے قافلے کا پیش رو بنوں گا
کیونکہ مَیں تو عصر کے شعور کا نمائندہ ہوں

---

# چین کے شاعر

## ماؤزے تنگ :

سوشلسٹ انقلاب کا سب سے بڑا رہنما ماؤزے تنگ جب شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے تو اس کی کلاسیکی روایت میں اختراعات کی صلاحیت اور بھی واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

ماؤزے تنگ کی کُل ۴۲ نظمیں رونگ مین نے انگریزی میں ترجمہ کی ہیں۔ اسی انگریزی ترجمے کو اُردو تراجم کے لیے بطور اصل سامنے رکھا گیا ہے۔

## لوسون :

لوسون نے کُل ۲۳ نثری نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں ۱۹۲۴ء سے لے کر ۱۹۲۶ء کے دوران لکھی گئیں۔ یہ سب نظمیں ایک مجموعے میں مرتّب کی گئیں جس کا نام "خود روگھاس" رکھا گیا۔ یہ نظم بھی اسی مجموعے میں سے لی گئی ہے۔

## کوموجو :

۱۸۹۲ء میں پیدا ہُوا۔ آج کل بھی چین کے مشہور اور منفرد شعراء میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس کا پہلا مجموعہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہُوا

اور بہت مقبول ہُوا۔ مگر بعد میں اس قسم کے اشعار باقاعدگی اور پختگی کے ساتھ سامنے نہیں آئے۔ اس کا شمار چین کے زمانۂ جدوجہد اور مزا راج کے شعرا میں ہوتا ہے۔

## فنگ چی :

شمالی صوبے ہوپی کا رہنے والا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں پیدا۔ پیکنگ یونیورسٹی سے بی۔اے پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے غیر ممالک گیا۔ ہائیڈل برگ میں اس نے جرمن اور فلاسفی کو خوب پڑھا۔ وہ گوئٹے، ہلڈر اور رلکے کا دلدادہ ہوگیا۔ رلکے کے سونیٹ کے تراجم تو بہت مشہور ہوئے مگر اس کی اپنی مطبوعات بہت کم ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں باہر جانے سے پہلے ہی اس کا پہلا مجموعہ شائع ہوگیا تھا۔ دوسرا مجموعہ ۱۹۳۰ء میں اور رلکے کا ترجمہ کتابی شکل میں ۱۹۴۱ء میں شائع ہُوا۔ اس کا آخری مجموعہ یعنی 'آخری دس سال کی نظمیں (۱۹۴۷ - ۱۹۵۷ء) کی نگارشات پر مبنی تھا۔

ماؤزے تنگ

# لیو یاٹسی کے نام

کینٹون میں چائے پینے کے دن کبھی نہیں بھولیں گے

وہ لمحے بھی نہیں بھولیں گے جب ایک دوسرے کو شعر سناتے سناتے

چونلنگ کی پتیاں سُرخ ہو گئی تھیں۔

اکتیس سال بعد، اپنے آبائی قصبے میں واپسی،

بالکل یوں لگتا ہے جیسے اپنے اچھے اشعار

اس وقت یاد کرو جبکہ شگوفے جھڑ رہے تھے۔

یاد رکھو دلوں کی شکست، اُداسی کی انتہا کو نہ پہنچ جائے،

اپنے ذوقِ بصیرت کو وسعت دو

تاکہ واقعاتِ عالم کو پرکھ سکو۔

یہ مت کہو کہ کونمنگ جھیل میں پانی پایاب معلوم ہوتا ہے

یہاں تو فوچنگ کیانگ کے مقابلے میں
مچھلی پکڑنا بہت پسند کیا جاتا ہے۔

ماؤزے تنگ

# برف

مُلک کا شمالی منظر
میل ہا میل یخ بستگی کا منظر
اور میلوں آگے برف کے ذرّے،
دیوارِ چین کو اِدھر سے اُدھر تک دیکھو
ایک وسیع و عریض صحرا
عظیم دریائے زرد، اوپر نیچے،
کیا اس کی جھاگ بیٹھ گئی ہے
پہاڑیاں سانپوں کی طرح ناچ رہی تھیں
پہاڑ، موم کے ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے
یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی حیثیت کا مقابلہ

خدا کی حیثیت سے کر رہے ہوں۔

ایک سہانی صبح تک انتظار کرو

جب دھوپ، تمھاری براق سیم تنی کو سنہرا کر دے

یہ منظر اور دل پذیر انداز میں ہویدا ہو۔

یہ زمین اپنی بے پناہ خوبصورتی کے ساتھ دمکتی ہے

اس نے اپنے لاتعداد جوان سپوتوں کو

اپنی حفاظت کی خاطر قربان کیا ہے

چن ہیانگ اور ہان وو!

تم پر ترس آتا ہے

تم دونوں ناشناس سخن ہو

تانگ تونگ اور سوانگ تو

فنونِ لطیفہ کے حظ سے عاری ہیں

اور وہ جنت کا بگڑا بچہ

چنگیز خاں

کہ جس نے کھنچی کمان سے

چیلیں شکار کرنی سیکھی تھیں

سب کچھ گزر چکا ہے

بڑے آدمیوں کے لیے

صرف اور صرف

یہ زمانہ آئینہ ہے۔

نوسون

# رائے کے اظہار کا ایک انداز

میں نے خواب میں دیکھا

مَیں ایک پرائمری سکول کے کلاس رُوم میں بیٹھا ہوں

اور ایک مضمون لکھنے کی تیاری کر رہا ہوں ۔

مَیں نے اُستاد سے پُوچھا کہ رائے کا اظہار کیسے کیا جاتا ہے

"یہ بہت مشکل ہے" اپنے چشمے کے شیشوں کے کونوں سے جھانکتے ہوئے

استاد نے کہا ۔

انھوں نے کہا "مَیں تمھیں ایک کہانی سُناتا ہوں "

"جب ایک گھر میں بچہ پیدا ہوتا ہے" تو سارا گھر بہت خوش ہوتا ہے

جب بچہ ایک مہینے کا ہوتا ہے تو پھر وہ اسے اپنے مہمانوں کے سامنے نمائش

کے لیے لے کر جاتے ہیں

ظاہر ہے کہ اس نمائش کا مقصود، تعریف کروانا ہوتا ہے۔

دیکھنے والا ایک شخص کہتا ہے "یہ بچہ امیر ہو گا" پھر اس شخص کا شکریہ

ادا کیا جاتا ہے۔

ایک اور شخص کہتا ہے "یہ بچہ افسر بنے گا" اب اس شخص کے جواب میں

اظہارِ تشکّر کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

ایک شخص کہتا ہے "یہ بچہ مر جائے گا"۔ اس شخص کو پورے خاندان والے

مار مار کر اَدھ مُوا کر دیتے ہیں۔

یہ تو ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ بچہ مر جائے گا۔ ہاں یہ، البتہ جھوٹ

ہو سکتا ہے کہ وہ بہت امیر ہو گا کہ افسر بنے گا۔

مگر جھوٹ کہنے پہ انعام و اکرام ملتا ہے اور ناقابلِ تردید اظہارِ حقیقت،

لائقِ سزا ٹھہرتا ہے... تم...

جنابِ والا نہ مَیں جھوٹ بولنا چاہتا ہوں اور نہ مار کھانے کی ہمت رکھتا ہوں

تو پھر مجھے کیا کہنا چاہیے۔

اس سلسلے میں کہو "آہ اس بچے کی سمت دیکھو۔ میرے لفظ... اوہ

میرے... اوہو... ہاہا... ہاہا... ہی ہی..."

لومو جو

# اے زمیں ! میری ماں !

اے زمیں ! میری ماں !
آسمان سحر کے رنگ میں پہلے ہی پھیکا پڑ گیا ہے
تم اپنی کوکھ سے بچّے کو نمو دیتی ہو
اب میں تمھاری کمر پر رینگ رہا ہوں۔

اے زمیں ! میری ماں !
جب بھی میں فردوس نما باغوں میں گھوما
سمندروں کی تہوں میں اُترا
تم نے مجھے سنبھالا دیا
تم نے مجھے وہ آہنگ دیا کہ جس نے میری رُوح کو آسودگی بخشی

اے زمیں ! میری ماں !
ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے
تم میرے لیے غذا ہو، زندگی ہو، پناہ گاہ ہو
مَیں تمھارے احسانات کا بدلہ کس طرح چُکا سکتا ہوں

اے زمیں ! میری ماں !
اب سے مَیں خود کو تہ خانوں میں مقید نہیں کروں گا
مَیں تمھارے کھُلے بے گیاہ میدانوں میں
اپنے فرض کو ادا کر کے
تم سے سُرخرو ہوں گا

اے زمیں ! میری ماں !
مَیں تمھارے فرض شناس بیٹوں اور کھیتوں میں کام کرتے کسانوں پہ رشک کرتا ہو
وہ تو انسانیت کے مسیحا ہیں
تم نے ہمیشہ ان کی ناز برداری کی ہے

اے زمیں ! میری ماں !
مَیں تمھارے پیارے کوئلے کی سیہ کانوں میں کام کرنے والے کارکنوں پہ رشک کرتا ہوں

وہ تو انسانیت کے مسیحا ہیں
تم نے ہمیشہ ان کی ناز برداری کی ہے

اے زمیں! میری ماں!
مَیں ہر شاخ، ہر ٹہنی، اپنے بھائیوں اور تمھاری اولاد پہ رشک کرتا ہوں
یہ سب لوگ کس قدر سرخوشی، آزادی، قناعت اور قوت کے ساتھ
اپنی اپنی زندگی کے مزے لُوٹتے ہیں۔

اے زمیں! میری ماں!
مَیں ہر جاندار چاہے وہ حشرات الارض ہی کیوں نہ ہوں، اس پہ رشک کرتا ہوں
ہاں مَیں پرندوں پہ رشک نہیں کرتا
کیونکہ انھوں نے پرِ پرواز وا کرنے کے لیے تمھارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

اے زمیں! میری ماں!
مَیں ہَوا میں اُڑنا نہیں چاہتا ہوں
نہ مَیں بَیل گاڑیوں اور گھوڑوں پہ سوار ہونا چاہتا ہوں
نہ مَیں موزے اور جُوتے پہننا چاہتا ہوں
مَیں تو ننگے پاؤں تمھارے اور قریب ہونا چاہتا ہوں۔

اے زمیں! میری ماں!

تم میرے وجود کی حقیقت کی گواہ ہو

مجھے اس بات پر یقین نہیں کہ تم خواب میں تخلیق شدہ ایک بلبلہ ہو

مجھے اس بات پر بھی یقین نہیں کہ میں ایک بے عقل مخلوق ہوں اور بغیر مقصد کے

مصروفِ عمل ہوں۔

اے زمیں! میری ماں!

میرا خیال ہے ہم سب ماں جائے ہیں

مجھے اس بات پر یقین نہیں ہے کہ آسمان پر جنّت کے سایہ دار مقام پر

میرا کوئی باپ ہے جو کہ رہتا ہے۔

اے زمین! میری ماں!

میرا خیال ہے کہ اس دُنیا کی ہر چیز تمھارے جسم کی تجسیم ہے

گرج تمھاری قوّت کا سایہ ہے

برف اور بارش تمھارے خون کے تموّج کا عکس ہیں۔

اے زمین! میری ماں

میرا خیال ہے کہ آسمان کا پھیلا پیالہ، تمھارا آئینہ ہے جس میں دیکھ کر

تم اپنا سنگھار کرتی ہو۔
اور دن کے وقت یہ سورج اور رات کے وقت یہ چاند
آئینے میں تمھارے سائے ہیں۔

اے زمیں! میری ماں!
میرا خیال ہے کہ آسمان کے سارے تارے
آئینے میں منعکس تمھاری تخلیقات کی آنکھیں ہیں
مَیں صرف یہ سوچ سکتا ہوں کہ تم وجود کی حقیقت کی گواہ ہو۔

اے زمیں! میری ماں!
میری پہلی ذات صرف ایک لاعلم بچّے کی ذات تھی
مَیں نے بس تمھاری شفقت سے حظ اٹھایا تھا
مگر مجھے تمھاری شفقت کا نہ مطلب سمجھ میں آیا تھا
اور نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس شفقت کا جواب کس طرح دینا ہے۔

اے زمیں! میری ماں!
اب مجھے احساس ہو گا کہ تم کتنا پیار کرتی ہو
اگر مَیں ایک گلاس پانی پیوں، چاہے وہ پانی کا گلاس رات بھر ٹپکتی شبنم

سے ہی بھرا ہو۔

مجھے معلوم ہوگا کہ یہ تمھارا دودھ ہے

میری زندگی بچانے والا مشروب ہے

اے زمیں ! میری ماں !

جب کبھی مَیں کسی آواز کو بولتے یا ہنستے سُنتا ہوں

مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ تمھارا گیت ہے

جو میری رُوح کو آسودہ کرنے کے لیے نغمہ ریز ہے

اے زمیں ! میری ماں !

میری آنکھوں کے سامنے ہر چیز مضطرب ہے

مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ تمھارا رقص ہے

اس رقص کے بہانے تم میری روح کو آسودہ کرنا چاہتی ہو

اے زمیں ! میری ماں !

مَیں ہر خوشبو اور ہر رنگ کو سلام کرتا ہوں

مجھے معلوم ہے کہ یہ کھلونے ہیں جو تم نے مجھے دیے ہیں
کیونکہ تم میری رُوح کو آسودہ کرنا چاہتی ہو

اے زمیں ! میری ماں !
میری رُوح تمھاری رُوح ہے
مَیں اپنی رُوح کو قوی تر بناؤں گا
تاکہ تمھاری شفقتوں کا جواب دے سکوں

اے زمیں ! میری ماں !
اب مَیں تمھاری شفقتوں کا جواب دوں گا
مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے پیار کرتی ہو اور میرے کام کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہو
مَیں تم سے انتھک کام کرنے کا سلیقہ سیکھوں گا۔

---

کرموجو

# بہار کے ریشم کے کیڑو !

ریشم کے کیڑو ! تم ریشم کے تار بُن رہے ہو
نہیں ، تم تو شعری سوغات تخلیق کر رہے ہو
کتنی ارفع ، کتنی مقدس کتنی نازک اور کتنی دلرُبا ہے تمھاری یہ شاعری
تمھاری یہ شاعری کن انتہائیوں کو چھُوتی ہے
میرے پاس تو اس کے بیان کے لیے الفاظ نہیں ہیں

ریشم کے کیڑو ! تمھاری شاعری
کیا یہ آوُردہ ہے کہ بے ساختہ ہے
کیا تم فنّی باریکیوں کے ساتھ تخلیق کرتے ہو
یا پھر یہ فطری بے ساختگی کا اظہار ہے

کیا یہ تم دوسروں کے لیے تخلیق کرتے ہو

یا پھر یہ تم صرف اپنے لیے بناتے ہو

ریشم کے کیڑو! مجھے ڈر ہے کہ تمھاری شاعری

کہیں محض بے ساختہ

اور غیر ارادی تو نہیں

فن کا وہ محل جو تم تعمیر کر رہے ہو

افسوس ہے کہ

وہ صرف اور صرف تمھارے اپنے لیے ہے۔

کوموجو

# مَیں تخیّل پرست ہُوں

مَیں تخیّل پرست ہُوں
مَیں سُورج ، اونچے پہاڑوں اور سمندر کی پرستش کرتا ہوں
مَیں پانی ، آگ ، آتش فشاں پہاڑ اور بڑے بڑے دریاؤں کی پرستش کرتا ہوں
مَیں زندگی ، مَوت ، روشنی اور اندھیرے کی پرستش کرتا ہوں
مَیں سویز ، پناما ، دیوارِ چین اور اہرامِ مصر کی پرستش کرتا ہوں
مَیں تخلیقی فنکاروں ، طاقتوروں ، گرم خون اور نرم دلوں کی پرستش کرتا ہوں
مَیں بموں ، غموں اور تباہی کی پرستش کرتا ہوں
مَیں بُت شکنوں کی پرستش کرتا ہوں ، مَیں اپنی پرستش کرتا ہُوں
کیونکہ مَیں خود ایک بُت شکن ہوں ۔

فنگ چی

# سانپ

میری تنہائی ایک لمبا سانپ ہے۔
خاموش اور بے زبان
اگر تم اسے اپنے خوابوں میں دیکھو گے
تو حیرت سے گنگ ہو جاؤ گے۔

یہ میرا وفادار ساتھی ہے
یہ گھر کے حزن سے درد چشیدہ ہے۔
اس کی تمنّا ہے کہ تمھارے سروں پر۔
کالے بھبھوت ریشم کے گچھّوں سے گھونسلیں بن جائیں۔
اور چاندنی کی کرنوں کی طرح ہلکے سے۔

یہ تمھارے پاس سے، خاموشی سے ۔

تمھارے خواب چُرانے کے لیے گزر جائے

خواب! جو کہ شعلہ رو قرمزی پھُول ہے

## الیگزینڈر بلاک :

۱۸۸۰ء میں سینٹ پیٹرز برگ میں پیدا ہُوا۔ بلاک نے ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں اپنی تخلیقات کے حوالے سے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۴ء میں سر مورس بورا نے بلاک کا پہلی دفعہ انگریزی میں ترجمہ کیا اور یوں بلاک کی شاعرانہ عظمت سوویٹ یونین سے نکل کر چہار دانگ عالم میں پھیلی۔ اگست ۱۹۲۱ء میں طویل علالت کے بعد اس کا انتقال ہُوا۔

الیگزینڈر بلاک

# اپنے دوستوں کے نام!

ہم بڑی راز داری سے
ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں
ہم ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں
ایک دوسرے کے بارے میں کچھ سُننا نہیں چاہتے
اور ہم ایک دوسرے سے سرکشیدہ ہیں
ہم کوشش بھی کریں تب بھی
نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتے
نفرت کرنا، ہماری عادتِ ثانیہ بن چکی ہے

پھر کیا ہُوا
اب جبکہ ہم میں سے ہر شخص نے

اپنے گھر کو نفرت کے زہر سے بھر دیا ہے
ہمارے گھروں کی دیواریں بھی بغض اور کشیدگی کے زہر سے تر بتر ہیں
کوئی جگہ نہیں کہ جہاں لمحہ بھر کو سر رکھ کے آرام کیا جا سکے

پھر کیا ہُوا
خوشیوں سے ایمان اُٹھ جانے کے باوجود
ہم ہنستے ہیں
اتنا ہنستے ہیں کہ ہم ہونٹوں پہ جھاگ بن جاتے ہیں
اور مدہوشی کے عالم میں
راستوں سے اپنے گھروں کے غاروں میں جھانکتے ہیں
اور بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں

ہم نے زندگی اور دوستی دونوں سے نمک حرامی کی ہے
ہم خالی لفظوں کے چرخے ہیں
پھر کیا ہُوا
ہم ان کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں

جو ہمارے بعد آئیں گے
جب ببول کی باڑ میں
ہماری خستہ ہڈّیاں، مٹّی میں مل کر مٹّی ہو جائیں گی
اور پھر بعد میں، کوئی عالِم
ضخیم کتاب میں ہماری داستان لکھے گا

چھوڑ دیہ لغویات
وہ عالِم بھی، معصوم نوجوانوں کو
حقیقتوں کی جامہ زیبی سے اذیت پہنچائیں گے
وہ ان کی پیدائش اور موت کو کسی نہ کسی نکتے سے مربوط کریں گے
اور اس کے ساتھ بے تکے حاشیے لگائیں گے

کتنے افسوس کی بات ہے
ہماری زندگیاں یوں اُلجھی ہوئی ہیں
اتنی اذیت اور اتنی بے چارگی
اور یہ اصول پرستی کے اندوختہ کا مظہر

نقادوں کے لیے ایک نئے شاخسانے کا سامان ہوگا

اور ببُول کے درختوں تلے قبر میں

کہ جہاں سو کر انسان اپنے بارے میں سب کچھ بھول جائے

کتابیں بند کرو ۔ خاموش ہو جاؤ

مَیں نے تمھیں کبھی کچھ نہیں لکھا

کبھی نہیں . . .

الیگزینڈر بلاک

# جانبازی

جانبازی، افتخار، استحصال، شہرت
مَیں اس تلخ زمین پر بھول گیا ہوں
جبکہ تمھارا چہرہ، میرے سامنے
میز کے کپڑے پہ ایک سادہ سے فریم میں
چمکا تھا

وہ وقت بھی آیا کہ تم سدا کے لیے گھر چھوڑ گئیں
مَیں اندھیرے ہی میں تمھارے تعاقب میں سرگرداں رہا
مگر تم نے دوسرے شخص کے ہاتھ میں اپنی زندگی کی طنابیں پکڑا دیں
اور مَیں تمھارے رخساروں کی ہڈیوں کی خوبصورت محراب کو بھی بھول گیا

دن گزرتے گئے

ایک لامحدود اُداسی مسلط ہو گئی

جبکہ معاشقوں اور شراب نے میرے مُنہ کا ذائقہ تلخ کر دیا

قتل گاہ میں کھڑے، مَیں نے تمھیں یاد کیا

مَیں نے تمھیں دوبارہ ایسے یاد کیا، جیسے مَیں اپنی جوانی کو یاد کر رہا ہوں

مَیں نے تمھیں یاد کیا، مگر تم نے مجھے قابلِ توجّہ نہ سمجھا

مَیں تمھارے لیے رویا، مگر تم پر کچھ اثر نہ ہُوا

تم نے اپنے آپ کو سنجیدگی سے نیلے فرغل میں لپیٹا۔

اور اپنے آپ ہی بھیگی ہوئی رات بتانے چلی گئیں

مجھے نہیں معلوم کہ تمھارے تفاخر نے کہاں دستِ مسیحائی پایا

میری پیاری، میری مہربان، میری خوشیوں کا مرکز

مَیں اپنے سارے خوابوں میں، تمھارا وہی نیل گوں فرغل

تمھاری کمر پہ بل کھاتا، لٹکتا

اور رات میں تحلیل ہوتا دیکھتا ہوں۔

الیگزینڈر بلاک

# ہاں، یہ وجدان کی آواز ہے

ہاں، یہ مرے وجدان کی آواز ہے
مرے دن کے خواب
اس سمت ضرور، پلٹتے ہیں
جہاں بے عزتی، اندھیرا، غربت اور گندگی بکھری ہوئی ہے
نیچے، بالکل نیچے، مسکین بن کر، نیچا ہو کر
دوسری دُنیا، بہتر طریقے پر دیکھی جا سکتی ہے
کیا تم نے پیرس میں بچوں کو خوف سے دُبکتے دیکھا ہے
یا سرما زدہ سین[1] کی بوجھل رفتار دیکھی ہے
تم زندگی کے تمام خوفناک اور اندھے راستوں کو سمجھو

---

[1] دریا کا نام

اپنی آنکھیں کھُلی رکھو
اس سے پہلے کہ زبردست طوفان بے قابو ہو جائے
اور تمھارے آبا کی زمین کا چہرہ مسخ کر دے
اپنے ہاتھوں کو آنے والے کاموں کے لیے تیار کرو
اور اگر تم نہیں کر سکتے
تو پھر بوریت اور غم کو اکٹھا ہو کر
تمھیں بھسم کر لینے دو
زیادہ بے عزّت ہوئے بغیر ہی
تم اس شرمناک زندگی کے داغوں کو دھو ڈالو
اور ایک بُزدل چھچھوندر کی طرح
زمین کھود کر روشنی سے اندھیرے کی جانب سفر کرو
اوندھے، ساکت، لیٹ جاؤ
اور شدّت کے ساتھ، دُنیا سے نفرت کرو
دُنیا کو بُرا، بھلا کہو
اور ہر چند تم مستقبل کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے ہو
پھر بھی، حال کی نفی کر رہے ہو۔

---

# گلیاں دھوپ دروازے

# ترتیب

## غزلیں

دِلوں کے خالی چرخوں پہ خوشیاں کیسے کاتی جائیں

# کشور ناہید!

عمر کے اڑتیس برس
تمھارے بالوں اور گالوں میں
اُترتی خزاؤں
اور ڈھلتے جذبوں کی آندھیوں میں
کچے ٹوٹتے پھلوں کی طرح
سارے رشتے
زندگی کے چندن روپوں کی طرح
گدرا گئے ہیں۔

کشور ناہید!
تم مُنہ بند سیپی کی طرح

زندگی کے سمندر میں
ہواؤں سے باتیں کرتے
پہاڑوں کی بُنیاد ہلاتے
اور لہروں کو اپنے بالوں کی طرح کاٹ کر
ساحل پہ
گزشتہ کی روایتی
اور آج کی مضطرب
عورت بن کر سوچ رہی ہو۔

کشور ناہید!
یہاں نہ کوئی بولتا ہے
نہ کوئی بولتی آنکھوں کے
لفظوں کو سمجھنا چاہتا ہے۔
ہاتھ سے پھسلتی مچھلی
خوف کو نفرت میں بدل دیتی ہے

کشور ناہید !

تمھیں خاموش دیکھنے کی چاہت

قبروں سے بھی اُمڈی آرہی ہے

مگر تم بولو !

کہ یہاں سُننا منع ہے

مُجھے جن جذبوں نے خوف زدہ کیا تھا

اب میں ان کے اظہار سے

دوسروں کو خوف سے لرزتا دیکھ رہی ہوں

دیے کی بتّی نے چوکھٹ پار کرلی ہے اور ہوا لرز رہی ہے

# مکافات

مَیں شاعری کرتی ہوں
کیوں کہ مَیں نے خودکُشی نہیں کی۔
مَیں زندگی کرتی ہوں
کیونکہ مَیں نے دلبری نہیں کی۔
مَیں نوکری کرتی ہوں
کیونکہ مَیں نے سروری نہیں کی۔

مَیں آگے ہی آگے چلتے رہنا چاہتی ہوں
کیونکہ پیچھے مُڑکر ویرانئ نقشِ پا دیکھنے کی ہمّت نہیں ہے۔
مَیں ہنستے ہی ہنستے مرجانا چاہتی ہوں
کیونکہ چہرے کے زخم آلود گڑھوں کو مجسّم کرنے کی ہمّت نہیں ہے۔

بیابان ماتھے

خزاں خوردہ آنکھیں

اور سوختہ جاں شوق

کیسے کیسے خزینے ہیں کہ لب کھلتے ہی نہیں۔

ہَوا کا ڈھول گلے میں ڈالو

اور دستکوں سے پوچھو

تم پلٹ کر تو نہیں آؤ گی!

بانجھ ہونٹوں سے التفات!

کیا لوگ کاغذ بھی کاتنے لگے ہیں؟

ساحل اور دریا کا فرق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

متوازی لکیروں کا فاصلہ ہمیشہ ایک سا ہوتا ہے۔

مَیں .....

مَیں ناگفتنی کرتی ہوں

کیونکہ مَیں نے گفتنی نہیں کی۔

# گھاس تو مُجھ جیسی ہے

گھاس بھی مُجھ جیسی ہے
پاؤں تلے بچھ کر ہی، زندگی کی مُراد پاتی ہے
مگر یہ بھیگ کر کس بات گواہی بنتی ہے
شرمساری کی آنچ کی
کہ جذبے کی حدّت کی

گھاس بھی مُجھ جیسی ہے
ذرا سر اُٹھانے کے قابل ہو
تو کاٹنے والی مشین
اُسے مخمل بنانے کا سودا لیے
ہموار کرتی رہتی ہے۔

عورت کو بھی ہموار کرنے کے لیے
تم کیسے کیسے جتن کرتے ہو۔
نہ زمیں کی نمو کی خواہش مرتی ہے
نہ عورت کی۔
میری مانو، تو وہی پگڈنڈی بنانے کا خیال درست تھا
جو حوصلوں کی شکستوں کی آنچ نہ سہہ سکیں
وہ پیوندِ زمیں ہو کر
یونہی زور آوروں کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں۔
مگر وہ پرِکاہ ہیں
گھاس نہیں
گھاس تو مجھ جیسی ہے!

# نیلام گھر

موت کا ذائقہ
لفظوں کے پیکر میں
اس کے ہونٹوں سے ٹپکتا ہے۔
وہ نفرتوں کو بوسوں کا رنگ دے کر
میرے مُنہ پر نیلے نیلے داغ ڈال کر
یہ جتانا چاہتا ہے
کہ اسے میرے جسم کو ہر طرح استعمال کرنے کا حق ہے۔
یہ حق بھی کیا عجیب ہوتا ہے۔
حق جتانے کی خواہش
محکومیت کی ڈھال پہ اپنا چھتر بناتی ہے
حق جتانے کی خواہش
ہر کذب اور ریاکاری کو صدقے ہوتی

محبتوں کا نقاب اُڑھاتی ہے۔
مگر نقاب کے نیچے سے چہرہ
اب تو اور بھی صاف اور بھی واضح نظر آتا ہے۔
ترغیب اور تذلیل یکجان ہو کر
زوج بنتے ہیں۔
نفرتوں کی جھیل میں پاؤں لٹکا کر بیٹھنے سے
ماتھوں پہ لکھی عزلتوں کی سیاہیاں دُھل تو نہیں جاتی ہیں
ہاں مسافتوں کی مایوسیوں کی مٹی
اپنا آپ چھوڑ دیتی ہے۔
تپے ہُوئے تنّور سے جس طرح پھُولی ہُوئی روٹیاں باہر نکلتی ہیں
میرے مُنہ پر طمانچہ مار کر
تمھارے ہاتھوں کی اُنگلیوں کے نشان
پھُولی ہُوئی روٹی کی طرح
میرے مُنہ پہ صد رنگ غبارے چھوڑ جاتے ہیں
تم حق والے لوگ ہو
تم نے مہر کے عوض حق کی بولی جیتی ہے۔

# ترا لُٹیا شہر بھنبھور

نیند نہیں آتی
بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی ہے
مَیں ستارے گنتے گنتے
یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی
تو تمھیں گلا گھونٹ کے مار ڈالنے کی گنتی سے کہیں کم ہے
تم میں بھی خواہش ہے
مُجھ سے خوبصورت بنے رہنے
اور نت نئے ڈیزائنوں کے کپڑوں میں
لپٹے رہنے کی۔
کیلنڈر کی تصویر بدلتی ہے
روز و شب کی تلخی نہیں بدلتی
روز، سہ پہر سے رات

قدموں کی چاپ کی بازیافت
یا ٹیلی فون کی گھنٹی سے
واپس آنے کی تسلّی کے حرف کی اُمید میں
بسر ہوتی، منتشر ہوتی رات، اور پھر دن
کریز میں سجے دُھلے دُھلائے کپڑوں
کی طرح گزُر جاتا ہے۔
سہ پہر سے رات
پھر وہی احساس
پھر وہی خواہش،
تالے میں چابی گھومتی ہے
مَیں کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہوں،
مرتبان میں بند
تتلی کی طرح،
صحرا میں گھومتے
اکیلے چیتے کی طرح،
مگر نیند نہیں آتی ہے

---

# جاروب کش

دوسروں کی سیوا
پتھروں کی سیوا کے برابر ہے
بہن ، بیوی اور ماں کے رشتوں
کی خاطر جینے والی
تم اپنے لیے بھی تو جیو !
دیکھو کنول کا پھول کیسے عالم
اور کیسے ماحول میں اپنی انا
اور اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے ،
تم کیوں آٹھ سال چھوٹے بھائی
کے غصّے بھرے تحکم کو مان کر

کھڑکی سے جھانک کر مُسکراتے چہرے
کی تلاش سے آنکھیں چُرا لیتی ہو!
تم کیوں پینتیس برس کی عمر کی ہو کر
خود کو سنوّارنا بند کر دیتی ہو
کہ تمھیں اپنے شوہر کے زہر میں بُجھے
فقروں سے طلاق کی بُو آتی ہے۔
تم ماں ہونے کے ناطے
اپنے اندر کے بچّے کو
گوشت پوست کے بچّوں کی بھینٹ چڑھا کر
ماممتا کا نام دیتی ہو!
جیسے کچے رنگوں کے دھاگے
پانی کے ایک ہی قطرے سے
رنگ چھوڑ دیتے ہیں
یہ سب رشتے
کچے رنگوں کے دھاگے ہیں
سب پتّھر ہیں

ان کے اُوپر چلو تو بھی لہولہان
ان کو سہو، تو بھی لہولہان
پر اپنے لیے جینا کیوں ممکن نہیں!
میری بنّو!
سُورج مُکھی کی طرح
گھر کے حاکم کی رضا پر
گردن گھماتے گھماتے
میری ریڑھ کی ہڈی چٹخ گئی ہے
جسم کا سارا بوجھ سہنے والی ہڈی
چٹخ گئی ہے

---

# سُنو جین آسٹن !

جین آسٹن !
تم نے کہا تھا
تم جتنا بھی چاہو
دیوانگی اختیار کرو
مگر دیکھو !
بے ہوش ہو کر، گر مت پڑنا !
جین آسٹن !
تم نے یہ اختیار اور جبر کا ترازو
میرے ہاتھ میں کیوں پکڑایا !

جین آسٹن !
تمھیں معلوم تھا
تولنے والے کے ہاتھ کانپ جاتے ہیں
تمھیں معلوم تھا
ترازو کے دونوں پلڑے
برابر نظر بھی آئیں
تو اصل میں برابر نہیں ہوتے ہیں
مَیں دونوں پلڑوں کو برابر
ظاہر کر کر کے ، ہانپ گئی ہوں
بے ہوشی کے ہوش کے لمحے میں
یہ چند باتیں تم سے
جین آسٹن !
کہ ظاہر میں موجود لوگ
تو سب مر چکے ہیں
میرے لیے

---

# تعبیر

مَیں نے اپنی ماں سے کہا تھا
مَیں تم سے نفرت کرتی ہوں
مَیں اِس جرأتِ اظہار پہ
آج تک نازاں تھی
آج میرے بیٹے نے مُجھ سے کہا ہے
"مَیں تم سے نفرت کرتا ہوں"
میرا بچپن پارہ بن کر
میرے خون میں تیَر رہا ہے۔

# سمجھوتہ

وہ کہتے ہیں
مَیں درشتی اور سنگدلی میں
ایک چٹان کی طرح ہوں
مَیں سوچتی ہوں
محبّت کی طلب اور احتیاط
کے کٹوروں کو
چٹانیں کون کہہ سکتا ہے
ہاں مَیں نے حلق میں چٹانیں بنالی ہیں
کراہیں ان چٹانوں سے ٹکراتی ہیں
اور واپس میرے جسم میں

نس نس سے پھُوٹنے کے لیے
بیتاب ہوتی ہیں۔
میرا سارا بدن جل رہا ہے۔
مَیں اس آنچ کو ہونٹوں اور آنکھوں تک
نہیں پہنچنے دوں گی۔
میرے حلق کی چٹانیں
فصیل ہیں میرے جذبوں کی
تمھارے فیصلوں کے رڈار پہ
ان مورچوں کی خبر نہیں پہنچے گی۔

---

# میری مانو!

اگر تم بات ہی کرنا چاہتی ہو
تو تمھاری سزا مَوت ہے
اگر تم سانس ہی لینا چاہتی ہو
تو تمھاری جگہ قید خانہ ہے
اگر تم چلنا ہی چاہتی ہو
تو پاؤں کاٹ کر ہاتھ میں لے لو
اگر تم ہنسنا ہی چاہتی ہو
تو کنوّیں میں اُلٹا لٹک جاؤ
اگر تم سوچنا ہی چاہتی ہو
تو کواڑوں کو مقفّل کر کے چابی کہیں پھینک دو

اگر تم رونا ہی چاہتی ہو
تو دریا میں چھپی مٹی اپنی آنکھوں پر مَل لو
اگر تم جینا ہی چاہتی ہو
تو خوابوں کے غار پہ مکڑی کا جال بن کے تن جاؤ
اور اگر سب کچھ بھولنا ہی چاہتی ہو
تو سوچو پہلے کونسا لفظ سیکھا تھا۔

---

# – × + = –

ارے کیا ہُوا

منھ پہ طمانچے کا نشان!

تنور میں روٹیاں یونہی لگتی ہیں

ارے کیا ہُوا

گردن پہ گلا دبانے کا نشان!

گیس بھری بوتل کا چھرّا دبانے سے ہی

بوتل کا رس تم پی سکتے ہو۔

ارے کیا ہُوا

فقروں سے چھلنی ہو کر، ہونٹوں پہ پپڑیاں!

کمان سے تیر نکلے تو کسے خبر کہ کون نشانہ بنے گا۔

پیروں تلے جنّت کی ہیروئن!

لولی پاپ کی قیمت بڑھ رہی ہے

اور تیری گھٹ رہی ہے

# ہم نے خواہشوں کے سارے پرندے اُڑا دیے ہیں

شروع شروع میں اچنبھے اچھے لگتے تھے
شوق بھی تھا اور دن بھی بھلے تھے
اچھے لوگوں سے ملنے کا شوق، جنوں کی حد تک
ہر لمحہ بیتاب لیے پھرتا تھا۔
جب کوئی اپنا ہیرو
اپنے آدرش کا پیکر سامنے آتا
جی یہ چاہتا
آنکھیں بچھائیں، دل میں بٹھائیں
باتیں سُنیں، اتنی باتیں
سیلِ زماں سے اونچی باتیں
دل کے گہرے غم کی باتیں
دُوری اور نزدیکی

لفظ بہت چھوٹے ہیں
ان لفظوں کو پرکھو تو
انسان اور بھی چھوٹے نکلتے ہیں
پاس بلا کر جسے دیکھو
اس کا چہرہ، فق، بے رنگ
بھبھوت کی صُورت، کالا کالا!
کیا سُورج بہت نیچے آ گیا ہے
کیا ماؤں نے بچے جن کے
دُودھ پلانا چھوڑ دیا ہے
گولیاں کھا کے، دُودھ کے سوتے
خشک کرنے والی ماؤں!
پلاسٹک کے بیگز میں رات رات بھر
بچّوں کا پیشاب جذب کرنے والی ماؤں!
نیند تمھاری بہت میٹھی ہے
ٹھیک ہے، تم بھی بے بس ہو
مرد گھروں سے غائب ہوں تو

ماں کی مامتا، بلک بلک کر
نیند کی گولی کے آنگن میں سو ہی جایا کرتی ہے۔
خواب آور گولی
یہ بھی تو آج کی اہم ضرورت ہے۔
مصنوعی پلکیں آنکھوں سے اُتار کے
اصلی چہرہ مت دیکھو
گولیاں کھاؤ، سو جاؤ، آرام کرو۔
صُبح تمھارے سر کے اُوپر سُورج کی
اور بھی گرم شعاعیں، رقص کریں گی۔
اچھے لوگ، صُبح کو کچُھ اور شام کو کچُھ
اور رات کو ان کے خون کی طغیانی میں
ان کے ہاتھ اور ان کی آنکھیں
بالکل جنگلی چوُہے جیسی معلوم ہوں۔
پہلے پہل یہ اچنبھا تھا
خوف کی تہ میں انجانے کو جاننے کی خواہش
مکڑی کے جالے کی مانند تھیں

پہلے پہل پستانوں میں درد کی ٹیسیں بہت اُٹھیں
پھر یاد نہیں
مصنوعی پلکیں اتنی لمبی ہیں
مَیں اپنے پَیر کے نقش کے آگے دیکھ نہیں سکتی ہوں
کہتے ہیں کہ ہَوا چلی ہے
کھیپ نئے لوگوں کی
جن کو اچھا کہنے والے ساتھ ساتھ ہیں
پہنچ گئے ہیں۔ شہر کنارے
سُورج اب تو اتنا نیچے آ پہنچا ہے
اس کو اُٹھا کے دُور کسی کونے میں دفن کرو۔
رات کی چادر اوڑھنے سے پہچان کا رشتہ
شُکر خدایا! ــــــ ٹُوٹ تو جاتا ہے
اے رب! تُو والیٔ کون و مکاں
تُو سب کے دِلوں کے حال سے واقف ہے
تو ہم کو بتا۔ ہم کیا سوچیں۔
ہم نے خواہشوں سارے پرندے اُڑا دیے ہیں

---

# FACE THE PAN

انڈوں کی جگہ
ہونٹ تلنے کا تجربہ کیسا ہے
ہونٹ بھی انڈوں کی طرح
گرمی سے ، بیک وقت
سُکڑتے اور پھیلتے ہیں
انڈوں کے چھلکوں کی طرح
ہماری شخصیت بھی اندر سے خالی
اور دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہے
مگر وہ تو عموماً برابر کے حصّے ہوتے ہیں
اوہو ! یہ برابری کا خواب

تمھیں باورچی خانے میں کیسے لے آیا ہے
انڈوں کے چھلکے تو ڈرائنگ رُوموں
میں بھی سج جاتے ہیں
تم کہاں سجو گی!

# نظم

مجھے خوشبو لگانے والے مردوں سے بُو آتی ہے
بے حس تعلّقات کی
مردہ مدارات کی
ان سے کہو
حرفوں کے علوم کی چھتوں کے پار
جو صحرا ہے
اس میں اگر تم یہی سپرٹ سے بنی
خوشبو بغلوں میں لگا کر گئے
تو تمھارا اِک اِک بال
کنکھجورا بن کر
تمھاری کھال میں جان قبض کرنے والے
پنجے گاڑ دے گا

---

# القاب

مَیں تاریکی کی انتہا میں ہوں

اور تم سے مخاطب ہوں

اگر تم میری جانب آؤ تو

اپنی مہربانی کے چراغ ساتھ لانا

مَیں محبتوں کی خوشبو، اپنے ساتھ بچا کے لائی ہوں

اور تمھاری منتظر ہوں۔

---

(ماخذ: فروغ فرخ زاد)

# ساحلِ مراد

وہ مجھے سُرخ پھُولوں کے باغ میں لے آیا
اور میرے بیتاب بالوں کو
سُرخ پھُولوں کی تاریکی میں چھُپا دیا
اور آخرِ کار
پھُولوں کی پتّیوں کی سُرخی
میرے ساتھ سو گئی۔

---

(مآخذ فروغ فرخ زاد)

## نظم

مجھے پانی کے جوہڑوں میں نہاتی
وہ عورتیں اور بطخیں اچھی لگتی ہیں
جنھیں کسی حرف آشنا نے
پاکیزہ نہیں کہا ہے

---

# نظم

اس نے چڑیا کو پروں سے دبوچا
چڑیا ہاتھ سے پھسل گئی
آنگن خُون سے تر بتر تھا
نائن آنگن دھو رہی تھی

# دُھواں چھوڑتی بسیں

ہماری عمریں تو بس سٹاپ پر
کالج کی بس کے انتظار میں گزُر جاتی ہیں
تم کہو کہ جن کے پیَر، ہوائی چپّل سے بے نیاز
ہَوا میں تیَرتے ہیں
بادلوں کو اوڑھتے ہیں
اور مخملوں کو مسلتے ہیں
تم نے کہاں عمر گزاری۔
آنکھوں کے گرد پھیلے حلقے
پپوٹوں پہ لگے رنگ سے
اور بھِل اُٹھتے ہیں

تمھارے مُنہ پہ بھی اُلٹا کے مارے ہُوئے
سالن کا ماسک سجے
تو مَیں بھی پُوچھوں
کہو، آنکھوں میں شبنم کو تیرتا دیکھ رہی ہو!
تمھیں بھی رات گئے، لوٹنے والے
پُرخور مسافروں کے پَیر دبانے پڑیں
تو پوچھوں
ہاتھوں پہ بہار کیسے کھل اُٹھتی ہے!
ہمارے پَیروں میں پھوٹے اُگ آتے ہیں
اور آنکھیں سلیٹ کی طرح صاف ہو جاتی ہیں
پھر بھی کماؤ پُوت کے لیے
کنیزوں کی طویل قطار سجتی ہے
جسے چاہو اپنی سزا کے لیے منتخب کر لو
اور یوں باقی عمر
اے کالج کے لیے بس کا انتظار کرنے والی لڑکیو
دُھواں چھوڑتی بسوں کی طرح، دھکّے کھا کھا کے گزار دو!

---

# زہر نما امرت

کھانا تو اِک شغلِ لذّتی تھا
مُنہ کے ذائقے میں زندگی کے تمام ذائقے در آتے ہیں
جیسے پانی کی لاکھوں بوندیں، ایک ہی بادل کی صورت میں
پھیل کر اپنا آپ چھپاتی ہیں
ایسے ہی بھوک کے روپ میں محنت کی
اِک ایک گھڑی یہ چاہتی ہے
مجھے شکتی دو
مرے ہر لمحے کی قیمت دو۔
انسان، انسان کا غلام بنے
جسے یہ بھی کہیں، انسان، انسان کے کام آئے

فیشن کی تہیں چڑھتی جائیں
عمریں سب کی بڑھتی جائیں
خواہش کی بھوک یہی کہتی ہے
دیکھو شفق، بس لمحوں کی مہمان ہُوا کرتی ہے
شکم، سے پہلے، خواہش کی ہر بھوک مٹا دو
کیسے ممکن ہے
خواہشیں، خواہشیں، کیسے گنوں میں
بھُوکے کو جب روٹی ملے تو
کھاتے کھاتے سانس بھی پھُول ہی جاتا ہے۔
ہم سب سانس کے رشتے سے
پھولے پیٹ کے ہانپ ہانپ کے سانس لیتے ہوئے
ماں جائے ہیں
بھُوکے ہیں، خواہش سے تپتے ہُوئے چہرے ہیں
آنکھوں میں ابن الوقتیوں کے کاجل نے
پھیل کے کام خراب کیا ہے
مُنہ دھو لو

آؤ دیکھو، نئی نئی اقسام کے کھانوں کا
دستر خوان بچھا ہے
بھوک بہت ہے
لیکن ہر لقمہ، جتنا چباؤ، اور بھی پھُولتا جاتا ہے
لقمے میں خواہش جاگ رہی ہے
لعابِ دہن اب ساتھ نہ دے
کھانا تو شغلِ لذّتی تھا
لذّت کس کے پاس ہے
مجھ کو لوٹا دو

---

# نوشتۂ دل

تم زندہ ہو
اور اُس اذیت سے آگاہ بھی ہو۔
خودکُشی سوچتی ہے کہ تمھیں وہ
مقابل دروازے سے نکال کرلے جائے گی
مگر وہ تو دروازے کی تصویر ہے
جو دیوار پہ آویزاں ہے
یقین کرو تم زندہ ہو۔
دیواریں، دروازے نہیں بنا کرتی ہیں
آگ کو پھول بنانے کے زمانے کب کے لد چکے
روزنوں سے جھانکنے سے کبھی سراپا نظر نہیں آتا۔

دیواروں پہ چپکے ہُوئے لفظوں کے لاشے
ایک پہ ایک لاشہ
آپس میں خلط ملط ہوتے نعرے
اتحاد پہ نفاق
اور ایمان پہ کفر کی تحریر
تاکتی جھانکتی سطریں
جانتے ہو، درد تغافل سے کم نہیں ہو جایا کرتا ہے۔
تم نے کسی کو قتل نہیں کیا ہے
مگر یہ تمھارے ہاتھ خون آلود کیوں ہیں!
تم نہ قتل کر سکتے تھے، نہ کرو گے
تم تو بس ارادہ کر رہے تھے۔
ہاتھوں پہ خون کی سُرخی
ماتھے پہ اذیت کی محراب
یہ کس وصل کی تیاری ہے!

# دفعہ ۱۴۴

ہم اندھے پن کے متلاشی ہیں
جہاں تمیز کی حدیں غائب ہو جاتی ہیں
اور ہم صرف لمس بن کر رہ جاتے ہیں،
لمس ۔ جو معذرت اور التجا کا آئینہ ہے۔
یہاں غُربت اور امیری رہے گی
اِس لیے کہ ہم ذہنوں کو چھُو کر، انھیں بے قیمت کر دیتے ہیں۔
درخت پتّے پہنتے ہیں
مگر خزاں، وصال کی شہوتوں میں انھیں زمیں دوز کر دیتی ہے۔

ہم بہرے پن کے متلاشی ہیں
کہ جہاں لفظ و معنیٰ، صرف ہلتے لبوں کی جنبش میں

قید ہوتے ہیں

جنبش ـــــ کٹھ پُتلیوں کے تار ذرا بھی غلط ہل جائیں

تو سارا کھیل چوپٹ ہو جاتا ہے

یہ کھیل تو رہے گا

اندر کے خوف کو رعشہ مت بننے دو

ہم گونگے پن کے متلاشی ہیں

کہ تالی بجانے والے آواز استعمال نہیں کرتے ہیں

آواز، آزاد ہو تو نعرۂ منصور

اور گھُٹ جائے تو حسن ناصر بن جاتی ہے

مگر گونگے چیخ تو سکتے ہیں

یہ کیوں ہے - یہ کیوں ممکن ہے !!

---

# تقریر نمبر ۲۷

میری آواز ، میرے شہر کی آواز ہے
میری آواز ، میری نسل کی آواز ہے
میری آواز کی بازگشت نسل در نسل چلے گی
کیا سمجھ کے تم میری آواز کو شور کا نام دے رہے ہو
کس برتے پر تم میرے اندازِ تخاطب کو مجنونانہ کہہ رہے ہو
کس زعم پہ تم بڑھتے ہوئے طوفانوں کو نظر کا دھوکہ
سمجھ رہے ہو

مَیں پیمبر نہیں ہوں
مَیں تو بس آج کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں

تمھاری وحشیانہ رعونتوں کی بو
پیسے کی ہوس کی شکل میں پھیل رہی ہے۔
تم لیموزین کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو
تاکہ شیشوں سے جھانکتی غربت کی سخت دھوپ
تمھارے سرجری شدہ چہرے کو مسخ نہ کر دے
تمھیں تقریروں کے نمبر اب ازبر ہو گئے ہیں
تقریر نمبر ۱۰، غریبوں کو جگانے کی آواز ہے
تقریر نمبر ۱۵، عورتوں میں شعور بیدار کرنے کی آواز ہے
تقریر نمبر ۲۷، ادیبوں، دانشوروں کو مشورے دینے
کی آواز ہے۔

آواز، آواز، آواز
غُل کسے کہتے ہیں
بے ہنگم آوازوں کے شور کو
کہ بے ربط تقریروں کے تموج کو۔
پتھر لڑھک رہے ہیں

صحرا میں پتھر پھینکو تو پتھر، ریت میں بے آواز دب جاتے ہیں
لیکن میری آواز پتھّر نہیں ہے
بجلی ہے
جس کی چمک کے بعد، گرج کا شور
سب سُنا کرتے ہیں
تیز گرج ہو تو کانوں پہ ہاتھ رکھ لینے سے
طوفان رُک نہیں جایا کرتے ہیں

موسم کا حال پڑھ کر موسم کے بارے میں تقریر کرنے والے
گلی میں بہتی نالیوں کو دیکھنے کب آئیں گے
شجر کاری کے دِنوں میں انقلاب کا پودا لگا دینے سے
انقلاب کا جنگل اُگا نہیں کرتا ہے
لال رنگ دو آنے میں ڈھیر سارا آجاتا ہے
مگر یوں دو آنے کے رنگ میں رنگے دوپٹے
خون کا عکس نہیں بن سکتے
مجھے اگر یہ سب کچُھ معلوم ہے

تو تمھیں کیوں معلوم نہیں

مَیں سچ کہتی ہوں

مَیں پیمبر نہیں ہوں

مَ ، تو بس آج کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں ۔

---

# التماس

دروازوں میں سوراخ کرکے، ہم اندر جھانکتے ہیں
اندر، وحشی ہُوا بند ہے
ہم اسے بگولوں کی طرح ناچتے دیکھ کر
دروازوں پر لوہے کی سلاخیں گاڑ دیتے ہیں
اور خود اپنی بے بضاعتی چھپانے کے لیے
اپنی فتح کا جشن مناتے ہیں۔
ہم خود اپنے آپ کو تسخیر کر رہے ہیں
اوکھلی کی طرح خالی سروں
ٹوٹی پھوٹی فٹ پاتھ کی طرح
ٹیڑھے میڑھے دانتوں

اور خالی بوتلوں کی طرح
پھوٹے جسموں کی بقا کے لیے
ہم ہوا کا راستہ مسدود کر رہے ہیں۔
ہم مصنوعی دانتوں سے کاٹنے والے
اور مصنوعی بازوؤں کو شمشیر زن سمجھنے والے ہیں
NOSTALGIA کے مریض ہیں
ہم راتوں کو خواب میں چلتے ہیں
اور دن کو اعلان کرتے ہیں
کہ منزل دُور نہیں۔
سوکھے ہُوئے سیب کی طرح
ہماری تاریخ کی جُھریاں بھی اب زرد سے
خاکستری ہوتی جا رہی ہیں
آنکھوں کے حلقوں کی سیاہی رات بن چکی ہے
رات ــــــ کہ ہمارا مقدر نہیں تھی
گمرہی ــــــ کہ ہمارا مقدر نہیں تھی۔
ایک ہی کمر کے جُڑواں بچوں کی طرح

یہ لوگ

ہماری دھرتی ماں کے پستانوں کو چھوڑ رہے ہیں

خُدا کے لیے یہ سوراخ بھی بند کر دو

تاکہ ہَوا

ایک دھماکے کے ساتھ باہر آجائے

تازہ ہَوا ۔

# دستِ غیب

وفاداروں کے ایک قبیلے نے، میرے کان میں آکر کہا
لگان وصول کرنے کے دنوں میں
تم حقدار کی باتیں کیوں کرنے لگتے ہو
بھلا پانی، زمین کے وصال بِنا، کچھ ہے؟
نہیں، تو پھر سُورج کے رُخ پر آئینے کے عکس سے
کاغذ جلانے کا کیا فائدہ
سُنا ہے اب کی فصل میں
گندم کے دانے اور بھی سنہرے، اور بھی فربہ، اور بھی زیادہ ہیں
مگر اس مرتبہ ان کے اندر، مغز نہیں، ہَوا بند ہے
پھُولے ہوئے سنہرے دانے

کہ جو کھوکھلے ہیں۔

اگر پیدا کرنے والا ناراض ہو تو
یُوں رزق کی نعمتوں کو بھی بانجھ کر دیتا ہے
میری آنکھوں کی پھٹی پتلیوں جیسے دانے
لگان بن کر، ہَوا میں تحلیل ہو جائیں گے
وفاداروں کا قبیلہ کہتا ہے کہ زبان کھولو گے تو
پہاڑ برف کے گالوں کی طرح اُڑیں گے۔
یہ تو لگان وصول کرنے کے دن ہیں
کیچڑ میں چلتے ہوئے ذرا پائنچے اونچے کر لو
کہ سفید پوشی کے خریدار تمھیں ڈھونڈ رہے ہیں
وفاداروں کے قبیلے نے پُورے چاند کی رات کو
سُورج گہن کا نام دیا ہے
اس کو سچ مانوں تو اپنی بصارت
اپنے آپ کو جھُٹلاؤں
میرے اندر تو، تصویر میں ٹھہرے
طوفان کا منظر دیکھ کر

جان لیوا طوفان کا خدشہ جاگ اُٹھا ہے

وفاداروں کا قبیلہ کہتا ہے

ملامتی صوفی مت بنو

مصلحت کا ہاتھ تھامو

کہ یہی دستِ غیب ہے۔

# اجازت دو

سب مہریں تسلیم
مگر کیا مَیں تم سے درختوں یا بادلوں کی طرح بھی
بات نہیں کرسکتی ہوں

اے میرے محبوب
مَیں تمھیں نہیں بچاسکی
مَیں تمھارے بارے میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکی
مَیں کہ شاعر تھی
لفظوں کی شہزادی تھی
اب بھیک مانگتی ہوں ان لفظوں کی
کہ جن میں آبرومندی کے دلاسے
اور حدّتِ فردا کے سندیسے ہوں

تو مَیں آسمان سے باتیں کرتی ہواؤں کو زنجیر کرلوں گی
تم مجھے بادلوں کی طرح ہمکلام ہونے دوگے
تو مَیں پیاسی للکتی زبانوں کا آسرا بنوں گی

اے میرے محبوب
اے میرے محبوب
تمھیں پتہ ہے
اُنھوں نے بیج کی نمو مار ڈالنے کے لیے
قبریں بھی کھود ڈالی ہیں
تمھیں پتہ ہے
اُنھوں نے دریاؤں کا رُخ موڑنے کے لیے
لاشوں کے پہاڑ بنا دیے ہیں
مگر میرے محبوب
مَیں کہ لفظوں کی شہزادی ہوں
مجھے شکتی دو
مجھے تم درختوں اور بادلوں کی طرح بات کرنے کی اجازت دو
اجازت دو!

---

# سُن ری سہیلی

آسمان سے بارشوں کی صورت برستا پانی
پھُول بنتا ہے، فصل اُگاتا ہے، کھیت بنتا ہے
مگر میرے آنسوؤں سے میرے غم کی کھیتی سیراب کیوں نہیں ہوتی ہے
میرے آنگنوں میں کھڑے گلاب کے پودوں کو
میرے آنسوؤں کا نمک، زہر بن کر کھا رہا ہے

اپنے آنسوؤں سے کپڑے دھونے والی نسلو!
مرادوں کا بہتا دریا آنکھوں کی جھیلوں سے پھُوٹ پڑا ہے
آنکھوں کے گرد حلقے، رنگریز کے رنگے ہوئے سیہ ابرے کی طرح ہیں
تم اپنے آنگنوں میں گیلی لکڑیوں کی طرح
دن بھر دھوپ میں سُوکھ کر کوئلہ بن چکی ہو

کوئلہ آگ بن کر چٹختا ہے
مگر تم میں تو یہ حوصلہ بھی نہیں،
ہاتھوں کی جھریوں اور آنکھوں کے حلقوں کی کمائی لیے
تم کیا چاہتی ہو۔
پتھر سے پتھر ٹکرائے تو پھر بھی آواز سنائی دیتی ہے
ستاروں کی روشنی، ان کی خامشی کو آواز میں بدل دیتی ہے
مگر بولتے انسانوں کی گفتگو
آواز کو خامشی بنا رہی ہے
اخبار میں لپٹے ہوئے پھول، بہار کی نشانیاں کیسے بنیں۔

# آخری خواہش

آج تو میرے کپڑے بھی پانی کی طرح بھاری ہیں
موت کا کاجل آنکھوں میں لگانا
اور آنکھوں میں پٹی باندھ کر تار پہ سائیکل چلانا
ایک جیسا عمل ہے
زندہ رہنے کا عمل
مردہ زندگی کی دریوزگی سے
انگور کی طرح رنگ بدل کر دو آتشہ ہونا
پگھلی ہوئی موم بتّی کی روشنی کے آخری وار
کی طرح کاری ہوتا ہے
بلّی اپنے شکار سے

پہلے کھیلتی ہے، پھر کھاتی ہے

آج جب کہ میرے کپڑے پانی کی طرح بھاری ہیں

میری بنتی سُنو

مُجھ سے کھیلنا بند کر دو

مجھے کھا جاؤ

---

# چشم زدن

اتفاقات دیکھو

ہم دونوں ایک ہی لفٹ میں تھے

بس ہم دونوں تھے

ہم نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور بس

قُربت لفظ کے بغیر مکمل ہو گئی

وہ پانچویں منزل پہ اُتر گیا

اور مَیں اوپر چلی گئی

جانتی تھی کہ اس سے پھر ملاقات نہ ہو سکے گی

یہ بھی جانتی تھی کہ اگر مَیں نے اس کا تعاقب کیا

تو مَیں اس کے راستے پہ مُردہ فرد کی طرح ہوں گی

مجھے یاد ہے
اس کے خیالات انگور کی مانند
اور جذبات شراب کی طرح تھے
مَیں رات بھر اس لذّت سے سرشار رہی
مگر صُبح ہونے تلک
خالی بوتلوں اور اُجڑے سگرٹوں کی صُورت میں
میرا جسم کمرے پہ محیط تھا۔

---

جاپانی شاعر جی رو۔ ہیراکی

# "مَوت اور مَیں"

جب مَیں "ٹائیفائڈ" سے مرنے والا تھا
مَوت میرے قریب آئی، اور سرگوشی کرتے ہُوئے بولی :
"اے میرے دیرینہ دوست ! کہو کیسے ہو ؟
اب وقت آگیا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو"
مَیں نے اُس کے بُلاوے کو قبول کیا اور کہا :
"ہاں ، اِس بُلاوے کا شُکریہ !
مگر مجھے تمھارے ساتھ چلنے سے پہلے
اس مکان کا کرایہ ادا کرنا ہے
اگر تم وہ کرایہ میری جگہ دے دو
تو مَیں چلنے کو تیار ہوں"

پھر موت نے کہا :

" اُف خُدایا !

میرے شب و روز بھی آج کل کس قدر خراب ہیں

میری جیب میں تو اس وقت ایک پیسہ بھی نہیں

اے ابلیس ! یہ کیا مصیبت ہے ؟"

اور یہ کہتے ہُوئے جھنجھلا کر ، مَوت واپس چلی گئی

بارش میری طرح ہے، تم پگھل کر ہی مجھ میں مل سکتے ہو

# کلیئرنس سیل

سُنو! اے بانوئے گُفت آشنا نیا قصّہ
نکل کے آئی ہے لیلیٰ حیا کے محل سے
سُنا ہے مسئلہ درپیش ہے چناؤ کا
ہو آبنوسی بدن، شاخسار بانہیں ہوں
کُشادہ، پیاسی، طلبگار، بے وضو آنکھیں
وفائے شب کے قرینے سے آشنا آنکھیں
طلوعِ دستِ مسیحا کی شکل میں پلکیں
جُھکیں تو سایۂ ابرِ سیاہ، یاد آئے
مہکتے ہار چمکتی گداز بانہوں کے
نثار ہوں نئے مہماں کی دلنوازی کے

عروسِ وصل کو فردوس آشنا کر دیں
زباں میں ذائقۂ وصل یوں رچے شب بھر
کہ ختم ہو نہ یہ قربت کی ساعتوں کی سحر
بدن کے روپ میں ، مے کی صراحیوں کی طرح
خمارِ شب میں ڈھلیں اور بھی گُلاب بنیں
زر و جواہر و لعل و گہُر کا عرق پئیں
نصیب جاگیں گے دوشیزگانِ نورس کے
نئی سحر کے پیمبر جگا رہے ہیں اُنھیں
چلی بھی آؤ ، بُلاتے ہیں ظلِّ سبحانی !

---

# کتنی چاہت والے لوگ ترے دیوانے

تقدیس کے لفظ سے ہاتھ رچا کے
پَیروں میں قیدی کی سی بیڑیاں ڈال کے
اسے حیا کا نام دیا ہے
کتنا سُندر کتنا پیارا نام ہے
ہیرے کی کنی جیسا
خنجر کی چمکتی لہراتی انی جیسا
وہ کہتے ہیں
اس سے زیادہ اور تجھے کیا چاہیے گُڑیے
مرمر جیسی چمکتی صاف، بلور دیواریں
تیری حفاظت کی خاطر، آراستہ و پیراستہ ہیں

ساگوانی لکڑی کے کالے کالے
دوہرے دروازے پہ سونے کی زنجیروں میں
دوہرے تالے کی موجودگی یہ تو بتاتی ہے
تیری خاطر، تیری حفاظت کی خاطر، تیری چاہت کی خاطر،
کتنے ارمانوں سے یہ سنگھاسن
یہ آدرش سے پیارا گھر
جس کے اندر پہلے چیخیں مار کے
یہ بھی دیکھا گیا ہے
کہیں کوئی آواز کسی دراڑ سے باہر جھانکنے کی ہمّت
جو کرے تو
ہانپ ہانپ کے جھاگ بنے گی
سلوٹ باہر آ نہ سکے گی
بڑے ارمان سے، تیری خاطر، تیری چاہت کی خاطر
یہ گھر یہ سنگھاسن یہ مرمر کی دیواریں
سب کچھ تیری خاطر
تیری چاہت کی خاطر!

# بجلی کی چمک کے بعد اور بادل کی گرج سے پہلے

مجھے جو دل کا فشار

احوالِ خواب لکھوں

وہ باب لکھوں

ادھورے لفظوں کی سولیوں پہ

کہ جن کی مہکار، پا بریدہ

کہ جن کی آنکھیں ہیں خوں چشیدہ

وہ وار لکھوں

جو بیتی صدیوں میں، آنے والے ہزار سالوں میں

میرے تیرے گلو میں پیوست، نیلے ترکش

فراق روئیں، ملال لکھیں

رفاقتوں کا جمال لکھیں

وہ پھول بانٹوں

کہ جن میں تیرے پلٹ کے آنے کی خوشبوئیں ہوں

کہ جن میں میرے گلے سے لپٹی، تری نگاہوں کی دُلہنیں ہوں

یہ حسرتیں ہوں

اجازتوں کی طناب ٹُوٹے

تو کُھل کے برسیں

بکھر کے چاہیں

جُھلس کے پھر زندگی کو ترسیں

یہ آرزو ہے کہ کُھل کے برسیں۔

# تم سے !

اتنی گرمی
میرا تن اندر سے بھٹی
باہر ۱۱۷ ، ۱۲۰ کی گرمی
مہندی ، لمحے بھر کو ٹھنڈک
بیچ ہتھیلی آن جگائے
پانی پنڈے پر ڈالو تو
آتی جاتی ٹھنڈک
رُوئیں رُوئیں میں
ٹھہر ٹھہر کے چین سجائے
ٹھنڈے پیٹ اور نرم کٹوروں

بیچ رکھے ہاتھوں میں جاگے
دُھوپ میں جیسے گیلے کپڑے
رات میں جیسے خواب کا نشّہ
پھیلے پھیلے اور بھی پھیلے
اُن چھُوٹی کلیوں کی دُودھ سفیدی
جاگتی ، بند ہوتی آنکھوں کی صُورت
پھُول میں ڈھلنے کو تڑپے تو
فاختہ جیسے بازو کھولو
انگڑائی کی گرمی تم سے نئی چنبیلی مانگ رہی ہے

---

# اعتراف

سہمی ہوئی ڈبکی چڑیو!
یہ تم ان سہمے لرزتے ہاتھوں سے کیوں خوفزدہ ہو
تم تو پھر بھی انجانے میں جال میں پھنس کے
آزادی کی لذّت سے محروم ہوئی ہو۔
ہم تو خود ہی اپنی زبانیں کاٹ کے
سُرخروئی کے احراموں میں لپٹے
سجدہ گُزار ہیں، محوِ ثنا ہیں

سہمی ہُوئی دبکی چڑیو!
تم کھیتوں میں دانے چُگنے آئی تھیں
اپنے لیے اپنے ہاتھوں سے رزق بنانے آئی تھیں۔

اپنے ہاتھوں، اپنے رزق کی چاہت
خوف کو کھا جاتی ہے
آنکھوں میں بھی ایک چمک سی بھر جاتی ہے

سہمی ہوئی دبکی چڑیو!
جال میں قید ہوئیں تم کیسے
صدیوں پُرانی کہانی ہے
یہ تو رسمِ زمانی ہے
ہم کہ جو صیّاد تھے، خود ہی قید ہوئے
ہم کہ جو شدّاد تھے، قسمتِ صید ہُوئے
ہم تو خود ہی اپنی زبانیں کاٹ کے
سرخروئی کے احراموں میں لپٹے
سجدہ گزار ہیں محوِ ثنا ہیں۔

# رات آتی ہے

دو بستر
ایک ہی کمرے ایک چھت کے سائے میں
ایک پہ بہتا نیند کا ساگر
ایک پہ بے خوابی کا صحرا
ایک پہ نرم ہَوا کے جھونکے
ایک پہ لُو سے گرم تھپیڑے

دو بستر
ایک پہ تکیے کی آغوش کا گہرا بادل
ایک پہ شکنیں، اُمڈے دریا جیسی
ایک پہ خواب کی دیوالی اور دہکے ہونٹ

ایک پہ آنکھ کی ویرانی اور سوکھے ہونٹ

دو بستر

ایک پہ کروٹ ، دریا ملے سمندر میں

ایک پہ کروٹ ، نکلے آگ کہ جیسے پتھر میں

دو بستر

بیچ نہ ساحل

اور نہ صحرا

پھر بھی ڈُونگا لمبا پَینڈا ۔

# بہلاوا

ڈر بالک کا یا ہردے کا
دونوں میں خوں رنگ اندھیرا
ہونٹوں پہ بھی سرد سویرا
بات بھی کرتے ہم ڈرتے ہیں
تجھ سے ملتے ہم ڈرتے ہیں
سانس بھی لیتے ہم ڈرتے ہیں
کیسی محبت، کیسی چاہت
پھول بھی چُنتے ہم ڈرتے ہیں
جھانک کے دیکھیں ہمسائے میں
کیا ڈر دیو وہاں بھی
اپنے پیلے دانت گاڑ کر چھوڑ گیا ہے!

## ہمزاد سے

ذات کے مقتل میں جینے کی طرح
مرنے کی تدبیریں
ہنسی کی کھوکھلی یلغار میں
بہہ جائیں تو
پھر نت نئے فقروں سے
محفل کو سجانے کی پرانی سرگزشتوں کو
نئے انداز سے روشن کرو
زندگی روشن کرو
ایوان و در روشن کرو
آنکھ میں لوشن کی تحریروں سے

اپنی پیاس کے صحرا میں
تو آراستہ جذبوں کو دکھلاؤ
سرابوں کے ہیولوں کے نشاں۔

یوں نہ ہو
کہ غم بھی خوشیوں کی طرح
لمحوں کی عزّت پا کے رخصت ہوں تو پھر
نوشن کی تحریریں بھی
گھُل جائیں پگھلتے درد کی یلغار میں۔

---

# کیتھارسس

مَیں ترے خوابوں کی دوست تھی
یاد ہے تو نے میری باہنوں میں
باتوں کے گجرے پہنائے تھے
تُو نے میرا جھوٹا پانی پی کے
میرے ہونٹ سنہرے چمکائے تھے
تیرے گھر میں مَیں آئی تھی
حرف بھی وصل کے پیرائے تھے ۔

کچّے پیالے پہ مُنہ رکھ کے
مَیں نے پیاس کی خوشبو سونگھی
اوس نے دید سے رشتہ باندھا

رس نے رنگ کی چولی پہنی
گھر میں خواب کی شاخ لگا کے
سوچا تھا دیوار ڈھکے گی
بیل عمریا چڑھ جائے گی

کتنے میٹھے خواب تھے جن کا
ذکر کرو تو ہونٹ کسیلے
کتنے انوکھے رشتے تھے وہ
خواب سے سچّے، خواب سے جھُوٹے

جینا مرنا ڈھونگ پُرانا
بچھڑ کے تجھ سے وہ بھی جیے گا
تو بھی ہنسے گی زندہ رہے گی
اس کے گھر بھی سبھا سجے گی ۔

# چوبِ خشک اور آگ

مرے عجز کو میرے خُدا کے سوا بھلا جانے کون
مرے شوق کو میرے گنہ سے سوا بھلا جانے کون
بھلا جانے کون تجھے اور مجھے
پہچانے کون تجھے اور مجھے
پہچان کی منزل کوئی نہیں
کوئی سب کچھ جان کے انجانا
کوئی سب کچھ دیکھ کے بیگانہ۔
جسموں کی ہیئت تو سب کی ایک سی ہے
اندر بھلا کس نے جھانکا ہے
اندر تو گھور اندھیرا ہے

ہاں سب کا باہر ایک سا ہے۔
ذرا جھانکو تو
جسموں کے دریچے دیکھو تو
آنکھوں کی پلکیں ایک سی ہیں
آنکھوں کے ڈورے ایک نہیں
بانہیں تو سب کی ایک سی ہیں
بانہوں کا جھولنا ایک نہیں
ہاتھوں کی گرمی ایک نہیں
باتوں کی نرمی ایک نہیں
کبھی تم نے تلوے دیکھے ہیں
کچھ تلوے چاند کے ٹکڑے سے
کچھ تلوے کنکر ذرّے سے
کچھ ہاتھ ملائم رُوئی سے
کچھ ہاتھ دلدّر مٹّی سے
پر دیکھے کون اِسے، پہچانے کون
مرے شوق کو، میرے گنہ سے سوا بھلا جانے کون!

# شادی کی بیسویں سالگرہ

کہتے ہیں لمحہ بیتے تو رنگ، مہک مر جاتے ہیں
کہتے ہیں دیوار گرے تو نقشِ گزشتہ مٹتے ہیں

ہم نے تپتی رات بھی پہنی
چڑھتے دن سا رُوپ سہا
شہد سا عشق الاؤ پہنا
برف سا قہر اور ظُلم پیا
ہم نے ہجر کی تاویلوں میں
خوابِ رفاقت راکھ کیے
ہم نے رزق کی زنجیروں میں
شب افسانے گوندھ دیے

میرے ساتھ کھڑے ہیں آج
تیری عمر کے بیس برس
زخم کے آتش دانوں میں
کیوں راکھ بھری ان برسوں کی
کیوں زعمِ رفاقت ریت بنا
کیوں چاند میں تیرتی مچھلی کا
خواب ہے اب تک خواہشِ جاں
کیوں سُوکھے پتّوں کے گھر میں
بیتاب ہُوا ہے شعلۂ جاں
مرے چہرے پہ تری خوکندہ
مرے دل میں کاغذ کی چڑیا
مرے گھر پہ غم کے ورق لگے
مرے بالوں میں چاندی دریا
مَیں بیس برس کی لہروں میں
کیوں ڈوب گئی ۔ کیوں ڈوب گئی

---

# دوسری موت

تم کہتے تھے ۔ مَیں ہوں نازک پھُول کی صُورت
جسم مرا پھولوں سے لدی، جھاڑی کی صُورت
چال مری ہے بادِ بہاری
آنکھ مری انگور کی پیالی
اور مری باتوں میں اصلی شہد کی خوشبو
اصلی باتیں، سچّے جذبے
گہرے پانی
جس کی تہ میں ہیرے موتی
جس کی تہ میں ریت نہ مٹّی
جس کی روانی، شرطِ جوانی

ہر لڑکی ایسی باتوں سے خوش ہوتی ہے۔

وہ وعدوں کی گرہ میں اُلجھی
عہدِ وفا کی رسّی پکڑے
ٹھنڈے گھر کی چھت کے نیچے
ریت کو پانی کا مس دے کر
کورے برتن کی صُورت میں
لمس مِلے تو بج اُٹھتی ہے

# FATHER COMPLEX

تمھارے گہرے گھنے چمکتے سفید بالوں میں
میری خواہش کی چاندنی کی اُداس صُبحیں
گداز پائیں
مَیں رُوٹھ جاؤں تو وہ منائیں
مَیں جانکنی کا نقاب اوڑھوں
تو دِل میں جھانکیں
مُجھے منائیں
یہ تیرے بالوں کی صُبحِ سادہ
مجھے سکھائے
سفید بادل، زمیں کی پیاسی زباں کی
حدّت مٹا نہ پائیں

تمھاری پیاسوں کی شانت شامیں
جھلس نہ جائیں ۔
مرے لیے شرطِ جاں عجب ہے
پلٹ کے دیکھوں
تو آگ رونق بنی ہوئی ہے
جو آگے جاؤں
تو بادلوں سے نکلتا سورج
پنہ نہ دے گا
وہ آسماں جو ہمارے کمرے کی کھڑکیوں سے
ہمارے جینے کا جھانکتا ہے
یہ پوچھتا ہے
تمھاری قسمت کے چاند گھٹنے کے دن
کبھی ختم ہوں تو سوچو
زمیں کی کروٹ میں
زندگی کی خمیدہ دیوار
گر نہ جائے ۔

# ترسی ہُوئی حِدّت کے دن

وہ دن گئے

وہ خوبصورت جذبہ و حیرت کے دن

خواب رنگ بیداریٔ خلوت کے دن

جسم کی ہر خیرگی کو جانتے

محتاط رشتوں کے صدف میں جسم کی ہر

رگ کے آبی رنگ کو پہچانتے

مضطرب ترسی ہُوئی حدّت کے دن

اب کہاں

وہ بادلوں کے جھرمٹوں میں آسماں چہرہ

کہاں وہ شاخسار

نو دمیدہ پھول پھل،
جن کی باتوں کا سنگھار۔
اب کہاں وہ گھر کہ جن کے صحن میں
لڑکیاں تازہ چنبیلی کے حسیں گجرے پہن کے
خواب کی چادر بنیں
اب کہاں وہ بام، جن پر کھنیاں ٹھہریں
کریں سرگوشیوں میں بات ایسے، لڑکیاں
نیچے گلیوں میں تپے جسموں کے لڑکے ٹھہر کے اوپر کو دیکھیں
اور پھر اس زلف کے سائے کو منزل جان لیں
اب کہاں وہ گھر
کہ جن کی محبّت سے ملی ہوتی تھی۔
وہ گلیاں نہیں
عطر کی خوشبو ہوا کے رنگ میں
عریاں پھرا کرتی تھی۔
بے آہنگ و رنگ
وہ دام گئے

پر کہاں!

جلتی ہُوئی سانسوں بتاؤ

انتظارِ آفتاب و گل

طلسمِ غم نمائی کیوں بنا؟

وحشتوں نے راستے کی گرد بن کر

میرے مہتابِ محبّت کو بھی گدلا کر دیا!

---

# زخمی پرندے کی چیخ

دیکھ ری ہماری ماں!
ہم نے دیش رنگ کو
سہاگ رنگ کر لیا
ہم نے دیش رُوپ میں
بھی رَین رنگ بھر دیا
ہم نے اپنے آنسوؤں کو
پھُول رنگ دے دیا
ہم نے اپنے آنچلوں کو
رات رنگ کر دیا۔
دیکھ ری ہماری ماں!

ہم نے تیری چھاتیوں کا دودھ بھی پیا نہیں
ہم نے تیری کھیتیوں کا رزق بھی لیا نہیں
ہم نے تیرے پانیوں کا ذائقہ چکھا نہیں
ہم نے تیری پستیوں کا قرض بھی سہا نہیں
دیکھ ری ہماری ماں!
تیری عزتوں سے کھیلنے کا نام
ہے اگر بہادری ، تو ہم کو بزدلی قبول
تیری کھیتیوں کو بیچنے کا نام
ہے اگر تونگری ، تو ہم کو عُسرتی قبول
دیکھ ری ہماری ماں!
ہمیں تو اپنا دُودھ بھی نہ بخشیو
کہ ہم نے دیش رنگ کو
سہاگ رنگ کر لیا ۔

---

# ہڑبیتی

میری ماں

دھرتی سمان ، دھیرج دھیرج

بِن محسوس ہی چلنے والی

میری ماں

پانی سمان ، ہولے ہولے

غم کی چٹانیں کاٹنے والی

میری ماں

چندا جیسی ، بِن گھبرائے

سب گھٹنائیں سہنے والی

میری ماں

برکھا جیسی ، بن بتلائے
اپنا آپ گھلانے والی
میری ماں نے
دن رنگوں کو چھاجوں برستے دیکھا تھا
میری ماں نے
شب خوابوں کو زینہ چڑھتے دیکھا تھا
اس کے ہاتھوں کے پیالے میں
سیر بھر گیہوں بھر جاتے تھے
اس کی بانہوں کے گھیرے میں
اس کے بیٹے چھُپ جاتے تھے
میری ماں
ہم تیری چھایا ، کیسے کلجگ کیسے خوار
سانسیں تھکی تھکی اور بیمار
ہمارے سائے کھیتی کھیتی رُوپ اُجاڑیں
زخم اُگائیں
راہ نہ پائیں

جہاں بھی جائیں ۔

ہم تیرے ہاتھوں پلے ہیں ماں
پر تیرے جیسے گُن کیسے ہوں
پاپ ہمارے پُن کیسے ہوں ۔

# پورٹریٹ

اُداسی جنگلوں کی
گفتگو بھی جنگلی لوگوں کی
ہر چہرے پہ خود [illegible]رد غم کی چھاپ
اور ہاتھوں میں تصویروں کے ڈھانچوں کے
ڈھلے اندھے ورق ۔
بے خواب آنکھوں کے دریچوں سے جھلکتی جانکنی کے سُرخ ذرّے
دم بدم گھٹتے ہوئے ماحول کی زردی
ورم سے پھولی، پیروں کی رگیں
خاموش ویراں رات کی صُورت
سیاہی کو سفیدی میں بدلتے بال

اُلجھی گفتگو،
خاموش اشکوں کی لڑی،
بے کار تمہیدیں،
تصنّع کی تہوں میں ایک ہی فقرہ
چلو اب مان بھی جاؤ!

# کنوئیں کی آواز

وہ وہم تھا
پر یہ حقیقت ہے۔
جاگیریں تھیں تو کہتے ہیں، ظلم بھی تھا
تعزیریں تھیں تو کہتے ہیں، نظم بھی تھا
تعزیریں مٹیں، جاگیریں مٹیں۔
مٹّی کی تقدیر کا جو بھی مالک تھا
وہ اس کا سچّا مالک تھا
ہو گا
ہاں وہم نہیں، سچ ہو گا

آنکھ میں سُرخی بن کے خون رُلاتے ہیں
رات جگاتے ہیں
شُبھوں کی گرد بہت اُڑتی ہے
سڑکوں پہ پگھلے تار کول کی صورت
خوشامد، اُبل اُبل کے
قدموں سے خود ہی لپٹ رہی ہے
شبہے اور خوشامد، مل کر کیا بنتا ہے
نئے زمانوں کا آدرش یا کیا بنتا ہے
یہ مت پوچھو، یوں مت دیکھو
جاگیروں کے رنگ نئے ہیں
جیتی جاگتی جاگیروں کی کھُلی کچہری
وہم ہے یا کہ حقیقت ہے۔

# آمنے سامنے

اے لہو

مَیں ترے کون سے انداز کو جھٹلاؤں گی

مَیں نے دیکھا ہے کہ کانٹے کی چُبھن سے بھی ترا

دروازۂ لب کُھلتا ہے

مَیں نے دیکھا ہے کہ افزائشِ انساں سے ترا

رنگ فزوں ہوتا ہے

مَیں نے دیکھا ہے ترے رنگ کے گُلزاروں کو

ذبح کے موسم برفاب میں

تطہیر کے سیلاب میں

[illegible]

مَیں نے عنّاب سے آہو کا چلن دیکھا ہے
جنگ کے آتشیں میدانوں میں
رنگ کے سرمگیں ایوانوں میں

اے لہو!
مجھ کو ترے گرم تنفس کی قسم
مَیں نے دیکھا ہے تجھے پرچمِ جاں بنتے ہُوئے
قرضِ ایماں تو کبھی نوکِ سناں بنتے ہُوئے
مَیں نے اے لعلِ بدخشاں
تری حرمت کی ضیا دیکھی ہے
تیری تحریر سے تسکینِ دُعا دیکھی ہے
پر مرے ہونٹ ترے لہجۂ آیندہ
کی خوشبو سے ہراساں کیوں ہیں
طائرِ خواب
ترے رنگ پریشاں کیوں ہیں
ہاں مرے لال
ترا ستیاں سوال

امتحاں میرے لہُو، میرے جواں بیٹے کے خوں کا ہے یہاں ۔
ہم اذاں دے کے بُلاتے ہیں
بگل اور بجاتے ہیں کہ آئیں
وہ سرافراز
جنھیں بازیٔ جاں
کرمکِ امروز لگے ۔
ہاں مگر اپنے لہو
اپنے جگر گوشے کو
اس قلزمِ خوں خیز کی آنچوں سے بچانے کو
لہو روتی ہوں
کششِ اُمید میں خوں بوتی ہوں
اے لہُو!
مَیں ترے کون سے انداز کو جھُٹلاؤں گی

---

# پہلی برسی پر

عدم آباد کی مٹّی سے سجاؤ
یہ در و بام
کہ مَیں نے غمِ ہستی سے
تعلق کی گزرگاہ کی
سب حاشیہ آرائی،
تہذیب کی وادی سے پرے
درد کے پُر ہول دھندلکوں کی
سبک سیریٔ موہوم کی یلغار سے آگے
کسی انجانے سفر کو رہِ مقصود بنایا،
تمھیں یہ رُخ بھی دکھایا!

کہ مجھے یاد ہے

مَیں نے ہی کہا تھا،

تمھیں تصویرِ تمنّا کا ہر اِک رنگ دکھاؤں گا،

ذرا سوچو تو

یہ بھی تو سیرئ ہستی کا تماشہ ہے

کہ مَیں رنگ سے محروم ہوں

اور پھول، ہراک رنگ کے بکھرے ہیں

مری قبر، مری شامِ تعلّق کے قریں۔

مانگ میں صبح کی تحریر سجاتے ہوئے

یہ ذہن میں رکھنا

کہ تمھیں دیکھتے رہنے کی تمنّا لیے

اِک شخص

تعلّق کی گزرگاہ کی خواہش میں ہے

اب خاک بسر۔

---

# اے کاتبِ تقدیر لکھ!

میری جیسی ماں نے جنی تھی
ہیر کہ جس نے زہر پیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
قرۃ العین جو کہلائی
جس نے علم کے سُوکھے پیالے کو تن زیب کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی
میرا بائی متواری
جس کے عشق کی گہری پیاس کو
پیمانوں نے لُوٹ لیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی

نور جہاں ، غم دیوانی
جس کے مزار پہ پھول نہ پتّی
جس نے فراق کا زخم سہا ،
میری جیسی ماں نے جنی تھی

قوسِ قزح سی قلوپطرہ
جس کے درد کو لذّت کہہ کے
جب چاہا مطعون کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی

نُوری ، سسّی اور سوہنی
اپنا آپ مٹا کے جنھوں نے
شہرِ وفا آباد کیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی

لمبی کھجور سی شہزادی
جس کو تیغ کی آنچ نے جُھلسا
جس نے جیون وار دیا
میری جیسی ماں نے جنی تھی

مُجھ جیسی بھی کوکھ جلی
قطرہ قطرہ زندہ رہ کر
جس نے مَوت کو مار دیا

---

# مَیں کون ہُوں

موزے بیچتی جُوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں
مَیں تو وُہی ہوں جس کو تم دیوار میں چُن کے
مثلِ صبا بے خوف ہوئے
یہ نہیں جانا
پتّھر سے آواز کبھی بھی دب نہیں سکتی

مَیں تو وہی ہوں رسم و رَواج کے بوجھ تلے
جسے تم نے چھپایا
یہ نہیں جانا
روشنی گھور اندھیروں سے کبھی ڈر نہیں سکتی

مَیں تو وُہی ہوں گود سے جس کی پھُول چُنے
انگارے اور کانٹے ڈالے
یہ نہیں جانا
زنجیروں سے پھُول کی خوشبو چُھپ نہیں سکتی

مَیں تو وہی ہوں میری حیا کے نام پہ تم نے
مُجھ کو خریدا مُجھ کو بیچا
یہ نہیں جانا
کچّے گھڑے پہ تیَر کے سوہنی مر نہیں سکتی

مَیں تو وُہی ہوں جس کو تم نے ڈولی بٹھا کے
اپنے سر سے بوجھ اُتارا
یہ نہیں جانا
ذہن غلام اگر ہے قوم اُبھر نہیں سکتی

پہلے تم نے میری شرم و حیا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
میری ممتا، میری وفا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی

اب گودوں میں اور ذہنوں میں پھولوں کے کھلنے کا موسم ہے

پوسٹروں پر نیم برہنہ
موزے بیچتی جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں

عرصۂ عشق مختصر مگر اُس کو بھُلانے میں عمر بیت جاتی ہے

❋

کہتے ہیں مَیں سوتے سوتے چلتی ہوں
ہنستا دیکھ کے لوگوں کو رو دیتی ہوں

خواہش میرا پیچھا کرتی رہتی ہے
مَیں کانٹوں کے ہار پروتی رہتی ہوں

گرمی کی بیکار دوپہروں میں اکثر
جلتی ہوئی زمین کی دھڑکن سُنتی ہوں

جب میرا چلنے کو جی نہیں چاہتا ہے
پاؤں کی دیوار بنا کے بیٹھتی ہوں

کھال پرانی ہاتھ سے گرتی رہتی ہے
بات پرانی پیٹ میں پالتی رہتی ہوں

دیکھ کے باہر منظر نئے بُلاوے کا
مَیں کھڑکی کو اینٹوں سے چُن دیتی ہوں

فاختہ بن کے اُڑنے کو جی چاہتا ہے
پَر آ جائیں تو گھر میں چُھپ جاتی ہوں

جاگتے میں لکڑی کی طرح سُلگتی ہوں
اور سوتے میں چلتی ہَوا سے لڑتی ہوں

اپنا نام بھی اب تو بھُول گئی ناہید
کوئی پُکارے تو حیرت سے تکتی ہوں

✺

پلٹ کے آئے تو دیوار و در نے حیرت کی
ہمارے ہاتھ میں تحریر تھی ہزیمت کی

کلنک اپنے مقدّر کا رات ٹھہرا تھا
بسا لیا اسے پھر گھر میں یہ مروّت کی

مثالِ گُل ترے پیکر سے رنگ جھڑتے تھے
مہکتی شام نشانی تھی تیری قُربت کی

مکان گونجیں گے مثلِ اذاں خرابوں میں
لہُو جگائے گی آنکھوں میں شام، غُربت کی

تجھے تو شوقِ جراحت نے مضطرب رکھا
بتا تو اس میں خطا کیا تھی ساری خلقت کی

زمیں پہ ٹوٹے ہوئے گھونسلے میں خون بھی تھا
چھپا لیا، در و دیوار نے مروّت کی

مزا تو یہ ہے کہ جب دوست نام پوچھیں گے
لگے گی چُپ ترے ہونٹوں کو خوں کی رنگت کی

زباں پہ لفظ کی آہٹ سے ہونٹ جاگے ہیں
یہی تو ایک نشانی ہے خوں کی حدّت کی

اب بات کرو بس آئینے سے
رستہ نہ ملے گا بھاگنے سے

جیبوں میں بھرو سکوں کی دولت
تکیوں سے لپٹ کے جاگنے سے

بدلے گا ورق ورق زمانہ
بس ایک تمھارے چاہنے سے

پہنے گی زمین میری رنگت
مٹی کو خلا میں ٹانکنے سے

پتھر میں لہو چمک اُٹھے گا
دیوانے کے ہونٹ کاٹنے سے

چہرہ ہے نقاب میں بھی عُریاں
غم اور چھُپا کے باندھنے سے

آنکھوں پہ لگا لو چار آنکھیں
منظر نہ ہٹے گا سامنے سے

اُترا ہے مرا وجُود شاید
پھُولوں کے اُداس آلنے[1] سے

---

[1] پنجابی میں چڑیا کے گھونسلے کو کہتے ہیں۔

مکیں سے خالی مکانوں پہ سخت پہرا تھا
ہُوا بھی کانپ گئی اس قدر اندھیرا تھا

ہم اپنے گھر میں پلے سرد مہریوں کے تلے
گھروں سے نکلے تو زہرابِ لب کا ڈیرا تھا

مری ہنسی کے صنوبر سے ڈر گئے وہ لوگ
کہ جن کے دل میں شبِ زہر کا بسیرا تھا

مری تلاش میں ٹھہرا ہُوا تھا دریا بھی
سجائے تھال میں دھوپیں، کھڑا سویرا تھا

سجا کے ریت کو ہاتھوں پہ لطف لیتے ہیں
وہ جن کو مَیں نے کھُلے پانیوں میں گھیرا تھا

زیاں ہے ذائقۂ جاں، زیاں ہے شب خوابی
پلٹ کے آئے تو دیکھا کہ زخم گہرا تھا

تمھیں تو یاد ہے سولہ برس کی وہ ناہید
نزاکتیں بھی عجب تھیں بدن چھریرا تھا

---

✺

ہری تھی شاخ تو بیٹھا نہ اس پہ پنچھی کیوں
لگے ہے اُجڑے ہوئے خواب سی یہ بستی کیوں

مجھے خبر ہے مرے گھر میں سانپ آنکھیں ہیں
وگرنہ غم کے خزینے چھپا کے رکھتی کیوں

تجھی سے تہمتِ عالم کی نسبتیں، موسوم
تجھی کو کہتے ہیں سب لوگ، سب سے اچھی کیوں

خزاں کو میرے ہی خوابوں کے نام کیوں لکھا
زمیں نے اپنی یہ دولت مجھی کو سونپی کیوں

مرا وجود بھی کیا، کچھ خدا سے ملتا ہے
سوال و شک سے ہے بیگانہ میری ہستی کیوں

یہ اشک، سلسلۂ جاں کے بولتے لب ہیں
چھپا کے دولتِ نایاب، تم نے رکھی کیوں

وجود اپنا کسے، کب عزیز تھا ناہید
ہوئی ہے شام سے پہلے ہی شام گہری کیوں

✺

بہل بھی جایا کرتے ہیں بہلانے سے
بات بنے گی یونہی بات بنانے سے

آنکھیں خواب دکھا کے روٹھا کرتی ہیں
زخم چھُپے گا لپ سٹک نئی لگانے سے

جھُوٹا کھایا اور جھُوٹے برتن دھوئے
ہنس کے عمر گزاری یوں انجانے سے

ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کے پھر جُڑ جائے گی
دیواریں ہل جائیں پردہ ہٹانے سے

اب کچھ کچھ سمجھی ہے دُنیا کو ناہید
اب کی بار نہیں مانی بہلانے سے

قریۂ ضبط میں تنہا ہوں مَیں
خواب کے جسم میں تیشہ ہوں مَیں

تازگی ہوں درِ گویائی کی
گفتگو کے لیے جلوہ ہوں مَیں

منتشر ہوں پھٹے کاغذ کی طرح
شاخِ گُل تیرا ہی ثمرہ ہوں مَیں

بے سبب ہوں ترے گھر میں موجود
کوئی کھویا ہُوا بچہ ہوں مَیں

مجھ سے بچھڑے گا تو رُسوا ہو گا
میرے دشمن ترا پردہ ہوں مَیں

خود کو پہچان لو مجھ سے مل کے
شہر کا ایک ہی رستہ ہوں مَیں

جھانک لو غار ہوں جالوں سے تنا
دیکھ لو طاقِ تماشا ہوں مَیں

کر لو تسکینِ تمنّا تم بھی
بات کرنے کو تو زندہ ہوں مَیں

ہیں بہت تیرے شناسا لیکن
تیری دہلیز پہ تنہا ہوں مَیں

جان لو قوّتِ امروز ہوں مَیں
دیکھ لو حدّتِ فردا ہوں مَیں

زمیں کی ہم سخنی، قسمتِ صبا بھی نہیں
رہیں کہاں کہ یہاں معتبر ہُوا بھی نہیں

غم و ملال کے آنگن میں پیڑ جلتے ہیں
جُھلس کے جائیں کہاں، کُوئے بے ادا بھی نہیں

مکاں ہیں بے در و دیوار، بے ستوں دَر و بام
اُسے خبر تھی، مگر شہر میں رُکا بھی نہیں

غروبِ مہر قیامت تھا کھنڈتے چہروں پر
دہکتے ہونٹ یہ کہتے ہیں، تُو مِلا بھی نہیں

سکونِ بازوئے قاتل نقیبِ طوفاں ہے
یہ وہ سزا ہے کہ جس سے سوا سزا بھی نہیں

رہِ جنوں کا بُلاوا ہے، دل فگار و چلو
کہ اس سفر میں مسافر تو ٹھہرتا بھی نہیں

سُراغِ منزلِ جاں کس سے پوچھنے جائیں
گھروں سے جھانکتی خلقت نے کُچھ کہا بھی نہیں

✵

آغوشِ طلب کا باب سوچوں
مَیں تیرے لیے وہ خواب سوچوں

جاگوں بن کے پلک پلک لب
شبنم کے بدن کی آب سوچوں

شامل ہوں مَیں تیرے رتجگوں میں
جاگوں بھی تو تیرے خواب سوچوں

تُو جائے تو منتظر ہوں تیری
تُو آئے تو بے حساب سوچوں

مَیں ریزہ ریزہ بکھر نہ جاؤں
کھولوں جو بندِ نقاب سوچوں

دیکھوں نہ مَیں آئینہ اکیلے
سانسوں میں بھی ہم رکاب سوچوں

بے تابیٔ جاں میں گُھل نہ جاؤں
صد پارۂ دل کی تاب سوچوں

بانہوں کے سمندروں میں اُتروں
آنکھوں میں لکھی کتاب سوچوں

جنگل ہے طلب کا اور مَیں ہُوں
کانٹوں میں چُھپا گُلاب سوچوں

شیشے کی فصیل میں مقیّد
امکاں سے سوا عذاب سوچوں

آنکھ کو ویرانیاں بخشیں تو آنکھیں کیوں نہ لیں
گھر سے نکلے تھے تو لُٹنے کی دُعائیں کیوں نہ لیں

ذائقہ خوں کا مری آنکھوں کی دہلیزوں پہ تھا
اے مرے قاتل مرے خوں کی بلائیں کیوں نہ لیں

سر پہ تو بھٹکی ہُوئی ویرانیوں کی دُھوپ ہے
جا نکلتیں جو ترے گھر پہ وہ راہیں کیوں نہ لیں

خوشبوؤں کی آہٹوں سے رنگ پگھلے خواب کے
ساعتِ جاں کو سجانے گُل قبائیں کیوں نہ لیں

بات کی تصویر میں پیکر، مری خواہش کا تھا
گلبدن وعدوں نے چہروں کی ضیائیں کیوں نہ لیں

سانس کا تھم تھم کے چلنا تھا شکستِ سازِ جان
لذّتِ خواہش نے زخموں کی ردائیں کیوں نہ لیں

پتہ ہواؤں کا پُوچھے ہے رہبری آخر
مِٹی ہے عرضِ تمنّا کی جانکنی آخر

خزاں نے کی ہے رقم قامتِ ستم ہر جا
صبا کو مِل گئی تائیدِ گمرہی آخر

سفر کے نام پہ بچھڑے ہیں ہمسفر سارے
کھُلا کہ شعبدۂ شب تھی سروری آخر

تمھارے لب تھے کٹورے ہمارے ہونٹ پیاس
وصال تھا کہ تھی تصویرِ تشنگی آخر

گماں نہ تھا کہ طلب بن کے ہجر جاگے گا
سنور کے آئے گی خواہش کی دلبری آخر

فصیلِ جسم میں زنجیرِ دل ہلاتی ہے
تمھاری یاد کہ موجود مجھ میں تھی آخر

شکستہ خوابوں کو جھولی میں باندھ کر رکھو
فضاؤں پہ ہے ہَوا کی سپہ گری آخر

---

پہن کے زخم کا ملبوس، اپنے گھر جانا
سمیٹ لو کہ ہے پھر شام کو بکھر جانا

ملی نہ لاش زمیں اور پانیوں میں کہیں
اسے ہی سارے زمانے سے خوش خبر جانا

پرندے سارے اُڑے جا رہے ہیں کس جانب
تمھیں خبر ہو تو دریا کے پار، اُتر جانا

وہ جس کی آنکھ میں سچ اور زباں پہ جھوٹ بھی ہے
وہ پاس آئے تو آنکھوں ہی میں اُتر جانا

لرز رہی ہے زمیں، سہمی لڑکیوں کی طرح
پکارتی ہے کہ تنہا نہ چھوڑ کر جانا

بندھے ہیں پیٹ سے بچّے بھی اور پیسے بھی
زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھ کر جانا

وہ جس کا شوق ہے کھلتے گلاب مل دینا
گلے ملو تو اسے بھی اُداس کر جانا

تجھ کو دل میں جھانکتے دیکھا تو شب تحریر کی
ہم نے اپنے ہاتھ سے زنداں کی بھی تعمیر کی

رنگ کے پھیکے لباسوں نے کیا افشائے راز
خوشبوؤں نے موسمِ گُل کی بہت تفسیر کی

غم بہت تھے کون سے لمحے میں کرتے کیا شمار
بادپیمائی تری خاطر پہن زنجیر کی

درد کے جوبن نے آنکھوں کو کیا خوں ناب یوں
ہے کھنڈر چہروں پہ لرزاں آنچ سی تقدیر کی

میرے اندر چھپ کے بیٹھا ہے مرا دشمن کوئی
چھن گئی لذّت مرے ہونٹوں سے بھی تقریر کی

---

٭

ہَوا کے ساتھ چلو گے ہَوا سے ڈر کر بھی
چُھپا ہے ظلم کا محرم تمھارے اندر بھی

کوئی ملال تو ڈھونڈو خرابۂ جاں میں
بناؤ تو کوئی تسکینِ جاں کے تیور بھی

صبا صفت تھے، تو کیوں بارِ دستِ سبز ہوئے
ہَوا کی گود میں ٹھہرے نہ کیوں صنوبر بھی

ہماری بے گنہی پہ ہمارے ہاتھ کٹے
وہ خلعتوں میں سرافراز، لے کے خنجر بھی

ثبوتِ حق کے لیے مُشتِ خاک بن جاؤں
کشیدِ خوں کے عوض کھینچ لوں سمندر بھی

ہم ایسے دشت نوردوں کو قید رکھنے کو
سلاخیں گاڑ گئے ہیں گھروں کے اندر بھی

مزاج اس کا مرے آنسوؤں سے ملتا تھا
جُھلس گئی ہوں مگر پانیوں کے اندر بھی

✺

میری ضرورت ہے تُو ، تیری ضرورت ہوں مَیں
کوچۂ پندار میں حرفِ ملامت ہوں مَیں

ناؤ کی صُورت چلوں موجِ ہَوا پہ رہوں
ساحلِ غم ڈوب جا داورِ قسمت ہوں مَیں

جاگتی آنکھوں میں بھی خواب سجاؤں ترے
رنگ لکھوں لمس کے قریۂ خلوت ہوں مَیں

جاؤں کہاں ڈھونڈنے تیری صدا کا بدن
تیری گواہی ہوں مَیں تیری صداقت ہوں مَیں

جاگتے رہنا تو اب جیسے مقدّر ہوا
وہ بھی تو ہے جاگتا اس کی ہی عادت ہوں مَیں

عمر کی خوشبو سے تھے دل کے بھی تیور جُدا
شام کی دھوپوں میں اب زہر کی رنگت ہوں مَیں

---

آپ کے بعد سحر بھی ہو گی
یہ دعا حرفِ اثر بھی ہو گی

اے شبِ ہجر سنائیں گے تجھے
خواب کی بات خبر بھی ہو گی

در بدر جس کے لیے رُسوا ہو
ایسی تصویر تو گھر بھی ہو گی

آبلے رنگِ حنا پائیں گے
آخرش حدِ سفر بھی ہو گی

خواب میں حرفِ بصیرت ہو گا
دشت میں راہ گزر بھی ہو گی

زرد چہرے پہ سجے گی سُرخی
گھر کو رنگوں کی خبر بھی ہو گی

مقتلِ شوق سجاؤ لیکن
میرے ہاتھوں میں سپر بھی ہو گی

---

✽

وہ خواب سا ہے تو خوابوں کو ہی سجائے کبھی
دکھا کے شکل مری پیاس ہی بڑھائے کبھی

وہ رنگ ہے تو کھِلے پھُول بن کے گُلشن میں
وہ تُند خُو ہے تو مَوجوں کو آزمائے کبھی

بدن کا شہر ہے سُونا کہو چلا آئے
وہ خواب بن کے مجھے رات بھر جگائے کبھی

کبھی چھٹے تو یہ کالی گھٹا جُدائی کی
دھنک کے رنگ تمنّا چُرا کے لائے کبھی

بدل کے نام مجھے آزمائے گا کب تک
مَیں اس کا نطق ہوں اعجاز آزمائے کبھی

نہ کوئی حرفِ سخن سنگ بن کے حائل ہو
وہ آئے اور یوں بے اختیار آئے کبھی

---

آنکھوں کی زردیوں میں چمک خواب کی سی ہے
تاریکیوں میں اب بھی جھلک آب کی سی ہے

مقتل ہے یا دُھواں ہے شکستِ نشاط کا
دریا کی تند خوئی بھی زہراب کی سی ہے

دھندلا گئے بدن کہ سفر ختم ہو گیا
دستک لبوں پہ پیاس کی محراب کی سی ہے

بُجھتے الاؤ دھونکتے آنکھیں اُبل پڑیں
وحشت گھوں کی تشنگی مہتاب کی سی ہے

معنی کے سارے رنگ ہیں تیغِ برہنہ سر
لفظوں کی کیفیت مگر کمخواب کی سی ہے

ناہید ان کی آنکھ میں مہر و وفا کہاں
خصلت کہ جن کی ساحلِ پایاب کی سی ہے

وہ زخم دے کے کہیں، پھُول کا مزا لیجے
نفورِ خلق سے، پیغامِ مرحبا لیجے

سکھائیے انھیں آدابِ زخمگی کہ جنھیں
یہ شوق ہو کہ لہُو کی نہ بد دُعا لیجے

زمیں کی تہ میں اترنے سے لب نہیں کھُلتے
فضا کے لمس سے مٹّی کا ذائقہ لیجے

ہَوا نہ دے کبھی موجود راستوں کا پتہ
یہ نقش بھی کھُلی آنکھوں سے جھانکتا لیجے

ستم تو یہ ہے کہ دشمن مقابلے کا نہیں
وگرنہ حوصلۂ دل کا فیصلہ کیجے

اُڑے ہیں ریت کے ذرّوں کی شکل میں چہرے
زمیں سرکنے لگی ہے، قدم جما لیجے

تمام لفظ بھی اپنا حساب مانگتے ہیں
مِٹا کے حرفِ غلط، شہر کی دُعا لیجے

---

✺

ہَوائے وحشتِ جنوں لے چلی تو چلتے پھر
کوئی نہ ساتھ تھا یہ جان کے سنبھلتے پھر

بھلا وہ رنج ہی کیا تھا کہ جی نہ سکتے پھر
گُلال مَل کے غموں کا ہمیں نہ ہنستے پھر

غُبارِ رنگ جو چھٹتا تو شکل بھی کُھلتی
حباب بن کے سہی، زندگی تو کرتے پھر

سراب آسا فسانے ہیں خوں کی رنگت کے
تمام شہر جگا کے ہیں لوگ ڈرتے پھر

لحاظِ غم سے تو آزارِ جاں نہیں مٹتا
وفورِ شعلۂ بیتاب سے لپٹتے پھر

---

طلب کی پیاس کو پھولوں میں بانٹ دیتا تھا
وہ خواب میں بھی مرے لب پہ اوس رکھتا تھا

اسے خبر تھی مرے مضطرب بہانوں کی
وہ حرف گر مرے کانوں میں پھول بُنتا تھا

اسے پلٹ کے بُلانے کا شوق بھی تھا عجیب
وہ دائروں کی طرح ساحلوں پہ چلتا تھا

مَیں کیسے خود کو تراشوں کہ تُجھ کو پا تو سکوں
تری گلی میں تو سورج بھی چھَن کے آتا تھا

کہاں سے ڈھونڈوں میں ان عہد چراغ آنکھوں کو
وہ شخص جو مرا ہر موئے تن سمجھتا تھا

بکھر گیا ہر اک اندیشۂ فنا ناہید
کہ میرا جامِ تمنّا چھلک کے بھرتا تھا

پھر اعتبارِ شب میں گھُلے زندگی کی شام
موجِ ہوائے تازہ بنے زندگی کی شام

تازہ رفاقتوں کی مہک سے کھِلے بدن
خوابوں کی خوشبوؤں سے سجے زندگی کی شام

معلوم ہے یہ سحر، گھڑی دو گھڑی کا ہے
پھر بھی کہو، سنبھل کے چلے زندگی کی شام

جو بوند خوں بھی جسم میں تھا، صرفِ غم ہُوا
اب اور غم بھی دو کہ بڑھے زندگی کی شام

دیکھا جو آئینہ تو بدن گونجنے لگا
ایسے ڈرا رہی ہے مجھے زندگی کی شام

شاید کہ کوئی خانماں برباد ٹھہر جائے
زنجیرِ دل ہلاتی چلے زندگی کی شام

پھولوں کے آنچلوں میں تو تتلی کے رنگ ہیں
بانہوں کی کیاریوں میں سجے زندگی کی شام

گہرا ہے آج درد کی پُروا کا گھاؤ بھی
ناہید جاں گسل ہے کہ ہے، زندگی کی شام

✺

ستم شناس ہوں لیکن زباں بریدہ ہُوں
مَیں اپنی پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہُوں

طلب کی زشت نے دیوانگی مقدر کی
شفق کے رُوپ میں، مَیں رنگِ آبدیدہ ہُوں

زیاں ہے قرمزی حدّت سے میرے سینے کی
مَیں مثلِ سنگ پٹخ کے بھی سنگ خوردہ ہُوں

علاجِ حرفِ شنیدہ کا کس سے ہو پائے
ورق ورق ہوں مگر حسرتِ رمیدہ ہُوں

شہید جذبوں کی قبریں سجا کے کیا ہو گا
کھنڈر ہوں، قامتِ شب ہوں، بدن دریدہ ہوں

وہ ماہ وسال کی شاخوں میں چھپ کے دیکھتا ہے
مَیں آئینے میں اسے دیکھ کے تپیدہ ہُوں

رُکے تو غم نے بھی ہم سے ہی آگہی مانگی
قدیرِ شب نے بھی سانسوں کی چاشنی مانگی

اُتر کے آنکھ سے آنسو ہُوا روانۂ جاں
اُداسیوں کے سبو نے سخاوتی مانگی

مَیں اس کی آنکھ کے زنداں میں کب تلک جاگوں
بھنور نے بھی تو ہَواؤں سے رُخصتی مانگی

زمیں نے آنکھ میں ڈھونڈی ہے خواب کی رنگت
لپیٹ کے بیل نے شاخوں سے زندگی مانگی

مَیں کیسے اس کو بتاؤں بدن میں خون نہیں
عجیب شخص تھا ، تصویرِ شربتی مانگی

---

آگے سرک رہے ہیں کہ سکتہ بھی ہے عجب
دیوار و دَر کو شوقِ تماشہ بھی ہے عجب

روزن ہیں اس قدر کہ توجّہ محال ہے
صحرا میں تشنگی کا حوالہ بھی ہے عجب

شاید اداس شاخوں سے لپٹا ہُوا ملے
اپنی گلی میں اس کا ٹھکانہ بھی ہے عجب

گنجان گھرے سبز درختوں نے بانٹ لی
وہ تیرگی کہ جس کا اُجالا بھی ہے عجب

دیوار و دَر کے رنگ ہیں آنکھوں پہ جم گئے
دہشت سے مر نہ جائیں کہ رستہ بھی ہے عجب

بکھرے حرُوف جوڑ کے لکھ دو کوئی تو نام
اس دل کے دُکھ عجیب ہیں مسیحا بھی ہے عجب

مَردوں کو سب روا یہ ہے عورت کو ناروا
شرم و حیا کا شہر میں چرچا بھی ہے عجب

حرفِ وصال، حرفِ گماں تک نہ بن سکا
تہذیبِ جاں میں غم کا مداوا بھی ہے عجب

بھیجی ہیں اُس نے پھُولوں میں مُنہ بند پیاں
انکار بھی عجب ہے، بُلاوا بھی ہے عجب

# ملامتوں کے درمیاں

# ترتیب

## غزلیں



## طویل نظم



## دو نظمیں



## نثری نظمیں

هم زیستی

*

راتوں کی مہار پکڑے دن تھے
تُو تھا تو چنار جیسے دن تھے

تازہ تھا لبوں پہ شوقِ منظر
آہٹ کے سبُو میں ڈھلتے دن تھے

خوشیاں تھیں بدن میں زینہ زینہ
پوروں کے وصال جیسے دن تھے

قدموں میں ہوئی تھی شب دو زانو
ایڑی پہ کھڑے، گزُارے، دن تھے

شاخوں پہ کھلے ہوں پھول جیسے
یُوں خواب و خیال جیسے دن تھے

دیوار پہ بیل چڑھ رہی تھی
خوشبو کی ندی کنارے دن تھے

اِک سانس میں بات تھی، ہنسی تھی
نیندوں میں ہَوا کو تھامے دن تھے

موجوں کے لہرئیے رنگ اوڑھے
گُزرے تو لگے، مہینے، دن تھے

---

یہ دل نے شرطِ وفا کا عجب ارادہ کیا
سفر کا قصد کیا اور پاپیادہ کیا

سنبھال کے رُخِ خورشید اپنے ہاتھوں میں
سحَر نے رنگ پہن کے ہَوا کو جادہ کیا

اُسے تھا شوق سمندر کے ساتھ چلنے کا
سمجھ گئے تھے تو پھر دل کو کیوں کشادہ کیا

تمام فاصلے سمٹے تھے کُوزۂ گل میں
وہ سامنے تھا کہ جب اُس کا رُخ، ارادہ کیا

بدن میں خوشبوئے جاں بھی ترے وصال سے تھی
اِسی لیے تو ترا ہجر بھی زیادہ کیا

تجھے خبر بھی نہیں تیرے شب نشینوں نے
ستارۂ سحری کو زمیں نہادہ کیا

مقدّروں کے شجر بے ثمر رہے ناہید
اگرچہ ہم نے بہت فصلِ گُل لبادہ کیا

وُہ دعوتِ سخن ایجاد ، پھر نہیں آئی
شبِ وصال ، ترے بعد ، پھر نہیں آئی

مجھے ملو تو تمنّا سے پُوچھ کر ملنا
گُلوں کے کِھلنے کی میعاد ، پھر نہیں آئی

گلاب طاقوں میں آنکھیں سجائے بیٹھے ہیں
نسیم جانبِ شمشاد ، پھر نہیں آئی

پھر اس کے بعد نہ چہرہ ، نہ رنگ ہی ٹھہرا
فضائے تابِ شبِ رعد ، پھر نہیں آئی

سفر نصیب محبّت، پڑاؤ کیسے کرے
کہ کوئی چہرہ کوئی یاد، پھر نہیں آئی

ہنستے رہے ہم اُداس ہو کر
آنسو بھی گرے تو دل کے اندر

قبروں کو بہن بنانا سیکھیں
بالوں میں نئی رُتیں سجا کر

مَیں گھر میں بھی اس سے ملتی کیسے
دیوار کھڑی تھی گھر کے اندر

مِٹ جائے بدن کا جاں سے رِشتہ
آئیں گے خطوط پھر بھی گھر پر

دیکھا تو زمیں کھسک رہی تھی
بیٹھے تھے بنا کے گھر زمیں پر

پانی کا بہاؤ تھم گیا ہے
نکلی ہے ندی سے وہ نہا کر

اب صرف لباس رہ گیا ہے
وہ لے گیا کل بدن چرا کر

---

خُوئے ملال نے بدلے چہرے
اشک ڈھلے اور لمحے ٹھہرے

آنکھیں دہکتے آتشداں سی
بستر جیسے بادل گہرے

محفل چڑھتے دریا جیسی
باتیں پھول گلاب سُنہرے

روشنی صرف ہماری آنکھیں
پانی صرف ہمارے چہرے

دَر ، دروازے کائی جیسے
آنکھ پپوٹے خوف سے گھرے

دیوانوں کو پہچانیں ہیں
سنگ ، سلاخیں اور کٹہرے

دُلہن جیسے کورے کاغذ
گاگر جیسے بدن اکہرے

تُو کہ جس کی منکوحہ ہے
ایک بدن کے چالس چہرے

---

سحر نے شب سے ملاقات میرے گھر کی تھی
اسے بے خبر یہ نشانی تو پھر سفر کی تھی

یہ کیسی ضد کہ پلٹتی ہے لہر ساحل پہ
یہ حوصلے کی نمو تھی، کہ بات ڈر کی تھی

اُفق اُفق جو تمنّا کا چاند بن کے چڑھا
اُسی نے خواب کی دہلیز معتبر کی تھی

سمجھ لیا کہ بہت دے دیا زمیں کا خراج
زمیں نہ تھی، تو یہ نیّت بھی، راہبر کی تھی

وُہ کھینچ لایا شجر کا گُداز آنکھوں میں
گلے مِلا تو وہی چھاؤں مختصر کی تھی

پتہ نہ دے وہ مرے پاس دُور رہنے کا
وُہ چُپ رہا تو یہ تصویر بھی خبر کی تھی

ہِلال تھا کہ خمِ خواب تھا ، نہیں معلوم
خبر یہ ہے کہ دُعا اُس کو دیکھ کر کی تھی

سمیٹ لو کہ یہی منظروں کا حاصل ہے
اُس ایک آنکھ میں تصویر پورے گھر کی تھی

---

*

ہم کل سے اُلم کریں گے اُس کا
آئے گا نظر نہ جس کا چہرہ

کھینچیں گے لکیر اپنی حد کی
رشتہ ہے صبا سے رشک ایسا

مَیں ساتھ کھڑی ہوں تیرے ایسے
سایہ بھی دکھائی دے نہ میرا

باتوں کے بھنور میں ڈوب جاؤں
آنکھوں میں چھپائے دشت پیاسا

جلتی ہیں ہتھیلیاں تو سوچو
یہ زہر کہاں کہاں پہ ہو گا

سانسیں ہیں کہ ریل پٹڑیاں ہیں
دیکھیں ہیں کہ کون کون گزُرا

پاتا ہے مُراد پانے والا
گرتا ہے وہ شاخ سے پرندہ

عجب تھا مجھ سے ترے اشتیاق کا لمحہ
پگھل گیا گُلِ لب میں فراق کا لمحہ

قضا کیا ترے ایوانِ جاں میں فرضِ دُعا
کھُلا ہُوا میں زرِ انطباق کا لمحہ

معاملہ تو کسی دسترس کا تھا بھی نہیں
حذر کہ اب نہیں شرطِ سیاق کا لمحہ

یہ اضطراب تو ہے موجِ بے تماشہ کا
ملے تو کہنا کہ ہے افتراق کا لمحہ

گو اس کی شکل بہت مختلف نہ تھی سب سے
یہ مختلف تھا خمِ اتفاق کا لمحہ

خود اپنے شوقِ گزیدہ کو معتبر دیکھا
ٹھہر گیا تھا لبِ طمطراق کا لمحہ

غضب یہ تھا کہ اِدھر تشنگی لبالب تھی
کشیدہ قد تو ہُوا، گُلِ طباق کا لمحہ

اُٹھائے ہاتھ تو رستے میں اُس کے ہاتھ بھی تھے
ہتھیلیوں میں سجا اتفاق کا لمحہ

وُہ ساتھ ساتھ مرے مشعلیں اُٹھائے ہُوئے
چلا تو ہے، یہ مقابل ہے شاق کا لمحہ

---

✺

مجھ سے اپنے نام کے معنیٰ پوچھنے آیا تھا
اپنی شکل کے آئینوں کو ڈھونڈنے آیا تھا

بانٹنے بیداری کی چھاؤں کی لذّت
پُروا بن کے آنکھیں چُومنے آیا تھا

لپٹ کے دیواروں پہ چلتے سایوں سے
وہ بھی دشتِ دُعا میں گھومنے آیا تھا

اُس کو پاس بٹھا لینا پر دیکھنا مت
میری گلی میں گھر وہ بھُولنے آیا تھا

نام پتہ کیا پُوچھو ہو بس یہ جانو
دریا دیکھ کے خود ہی ڈُوبنے آیا تھا

دھڑکا تھا اِس گھر کا پہلا دروازہ
دریا اپنا رستہ پُوچھنے آیا تھا

چُٹکی جیسی نیند میں تھی لذّت ساری
خواب بھی سرشاری کو سونگھنے آیا تھا

اُس سے مِل کے رونے کی لذّت چکھی
گیلا کاغذ ہَوا میں سُوکھنے آیا تھا

اس کو کس کے ساتھ مِلا کر دیکھوں مَیں
وُہ تو ہر اِک چہرہ بُھولنے آیا تھا

غروبِ شام سے مَیں اس کے اختیار میں ہوں
پلٹ کے دیکھوں تو دریا لیے کنار میں ہوں

وہ اپنی دُھوپ مرے آنگنوں میں پھیلا کر
سمجھ رہا ہے کہ مَیں حدّتِ قرار میں ہوں

خیال ایک ہی رستے کا سو طرح آیا
گلابِ جاں تری خاطر عذابِ خار میں ہوں

وُہ جس نے ڈھونڈ لیا خود کو میری سانسوں میں
وُہ اب سخن کرے کیسے کہ مَیں فشار میں ہوں

سفر کے وقت اُسے بھی سفر کا خوف نہ تھا
وُہ مطمئن تھا کہ مَیں قوسِ اختیار میں ہوں

نکلتے دیکھا نہ تھا پتھروں سے پانی میں
ہَوا کے رُخ پہ فروزاں میں شب دیار میں ہوں

مَیں احتیاط کی حدِّ غروب پہ ہی سہی
مگر طلوع کسی مہتابِ انتظار میں ہوں

وہ جاگتا ہے مجھے دیکھنے کی خواہش میں
مَیں اُس کی خواہشِ بیدار کے حصار میں ہوں

عجیب طورِ تعلّق ہے، زخم بھرتا نہیں
اُسے بھلانے کو نکلو تو دن گزُرتا نہیں

زمیں نے عشق کیا خوشبوؤں کی آہٹ سے
یہ دیکھنے کو، کوئی آئینہ اُترتا نہیں

اُسے فسردہ دِلی راس آگئی ہے بہت
سکونِ جاں ترے کوُچے میں پاؤں رکھتا نہیں

کچھ اور طرزِ ستم، مشقِ ناز بے گنہی
کہ اس دیار میں پتھر سے کوئی ڈرتا نہیں

اُتر کے آنکھ میں کس جا رہوں کہ واقف ہوں
نصیبِ وسعتِ صحرا بھی دل میں رکھتا نہیں

جزیرے خواب کے ، ساحل کے اس طرف آباد
سفر کا شوق ہے ، کشتی میں پاؤں دھرتا نہیں

حدیثِ زہرۂ جاں ، کوئی ناوکِ تازہ
کہ اب تو کوئی بھی صدمہ اُداس کرتا نہیں

---

✻

ذہن رہتا ہے بدن، خواب کے دم تک اُس کا
پھر وہی رنج وہی خیمۂ غم تک اُس کا

میری آنکھیں مری دہلیز پہ رکھ دیتا ہے
خاص ہے میرے لیے شوقِ ستم تک اُس کا

ہے مرے آبِ محبّت سے وہ شاداب بہت
میری پہچان میں ہے قامتِ نم تک اُس کا

بادباں اب تو ہواؤں کو بھی پہچانتے ہیں
ہاتھ پہنچا ہے بہت دیر میں ہم تک اُس کا

دلِ افسردہ ، سرِ شام سُلگ اُٹھتا ہے
ساحلِ جاں رکھے، اب کیسے بھرم تک اُس کا

وہ تو جھونکے کی طرح آگے گزر جاتا ہے
دشتِ جاں اس کا ہے اور خوابِ ارم تک اُس کا

کوئے احساس ترے حوصلے تسلیم، مگر
صحنِ زنداں ہی لگے، نقشِ قدم تک اُس کا

بات آئینے سے کرنے کو بھی موقع ڈھونڈیں
خلوتِ شوق تراشے ہے صنم تک اُس کا

---

٭

لبِ ساحل بھی تو اب دامنِ دریا کم ہے
شہر جلتا ہُوا دیکھوں تو تماشا کم ہے

مَیں فقط سلسلۂ شب سے گلہ مند نہیں
قوسِ خورشید، ترا خواب اُترتا کم ہے

اس کی عادت ہے کہ پتّھر سے بھی باتیں کرلے
اس کے آنے میں محبّت کا تقاضا کم ہے

گُل فروشی میں بھی مشّاق ہیں عشّاق ترے
صحنِ گلزار بھی دیوار پہ ہنستا کم ہے

خواب صورت نظر آتا ہے سرِ شامِ فراق
یوں تو کہتا ہے کہ وہ گھر سے نکلتا کم ہے

---

حیرانیٔ اُمید نے پہلو نہیں بدلا
کچھ خواب بھی بدلے نہیں کچھ تو نہیں بدلا

معبد سے نکلتا ہے دھواں سانس کی صورت
پیکر کو بدلنے سے وہ خوش رُو نہیں بدلا

بے خواب ارادوں کو زمیں وصل نہ کرنا
خوں رزق تھا جس کا وہ ترازو نہیں بدلا

زنداں مری تہذیب کا بنیاد ہے اب تو
اندازِ شہنشاہیٔ ابرو نہیں بدلا

املی کے درختوں کی کوئی شاخ نہ لینا
کہتے ہیں کہ اِس پیڑ کا جادُو نہیں بدلا

مَیں چُپ کی گزرگاہ پہ آنکھوں سے چلوں گی
رکھوں گی بھرم یہ کہ سخن خُو نہیں بدلا۔

---

✺

خبر ہے سانس بھی لینے کا یہ زمانہ نہیں
ہمیں بھی اُن سے تمنّائے محرمانہ نہیں

پسِ غبار نظر آؤ گے چلو تو سہی
تمہارا ساتھ جو دے وہ تو یہ زمانہ نہیں

کسی بھی ڈھب سے رہو آرزوئے دل معلوم
گزُرتی شب کا زمیں آخری ٹھکانہ ہے

بدن کو سر سے جُدا دیکھنے کی فصل ہے یہ
نجیبؔ شہر کا گُلشن سے دوستانہ نہیں

سمندروں کی ضعیفی نہ آسماں سے چھپی
شناوروں کو بھی تائیدِ قدسیانہ نہیں

سفر کو اپنے لیے معتبر سمجھ کہ تجھے
فراغِ جاں وہ ملی جس میں آب و دانہ نہیں

ٹپکتے خوں کو قدِ خود کشی کا نام نہ دے
حذر کہ قافلۂ جاں ابھی روانہ نہیں

گزشتہ خواب ہوا نے لکھے ہوئے ہیں کہیں
خوشا کہ دستِ تہہِ سنگ مجرمانہ نہیں

بہت دنوں کی گھٹن شعر میں ڈھلی ناہید
بہت دنوں میں کھلا شہر میں دوانہ نہیں

کبھی ملال، کبھی اُس کا نام لکھیں گے
ہم اُس کے نام ہی اپنا سلام لکھیں گے

زمیں سے پُوچھیں گے اُس کی بساطِ آرائش
ہَوا پہ قامتِ فصلِ قیام لکھیں گے

سحر کی تیز روی اور شبوں کی کوتاہی
گزشتنی ہے جو دل پر تمام لکھیں گے

نشاطِ غنچۂ جاں، شہرِ بے اماں میں کہاں
بشارتوں کے صحیفوں کو خام لکھیں گے

طنابِ لمحۂ دوراں ہی طوق ٹھہرے گی
حروف بول اُٹھیں گے، غلام لکھیں گے

ہزار چہرے خمِ حاشیہ بنیں، لیکن
سمندروں کو بھی خیراتِ عام لکھیں گے

مری سند پہ ہَوا بھی گواہیاں دے گی
تمہارے ظلم تمہارے ہی نام لکھیں گے

وہ شب کہ جس کا بدن، آسماں کا گریہ تھا
قیامتوں نے بھی ایسا سماں نہ دیکھا تھا

زمیں کو شوق تھا خوابوں کے رزق کھانے کا
صلیب کو بھی گلہ ہے کہ خوں نہ ٹپکا تھا

فغاں قبا تھی مری بستیوں کے جسموں کی
وہ جب چلا تو سمندر بھی ہاتھ ملتا تھا

دُعا کی نہر میں مایوسیوں کی ریت بھری
زبانِ خواب، فقط آبلوں کا صحرا تھا

قضا بھی سُرخ رُو، اُس کا لہُو پہن کے ہوئی
وہ جاں کا قرض بھی ہنس کے اُتار آیا تھا

صلیبِ تشنہ، تری پیاس بجھ گئی اب تو
زمیں پہ خواب کا سایہ ترا نوالہ تھا

زمیں تپے گی ابھی اُس کے خوں کی گرمی سے
وہ بے قرار لہُو، قبر میں اُچھلتا تھا

حسابِ خُوں تو انھی آنگنوں میں ہونا ہے
رہائی کیسی، تمہیں شوق بھی رجز کا تھا

اُسے خبر تھی کہ تاریخ اس میں زندہ ہے
کہ اُس کا نام ستاروں میں کب سے لکھا تھا

✺

اُحکام بھی، تائیدِ اذیت بھی اُسی کی
تحریر ہے چہروں پہ ہزیمت بھی اُسی کی

وہ خشتِ زمیں زاد نہ تھا لعلِ سخن وَر
زندائی شب گیر تھی مہلت بھی اُسی کی

وہ قامتِ شمشاد، سمن بر بھی بہت تھا
دیوانہ بناتی تھی محبّت بھی اُسی کی

مَیں زخم ہوں بولوں تو لہُو رِسنے لگے گا
ٹُوٹے گی قضا بن کے مشیّت بھی اُسی کی

زخموں پہ تصرّف ہے تو دیوار سجاؤ
نکلی ہے ہَوا اوڑھ کے حسرت بھی اُسی کی

---

✺

یہ کیا خواب تمہارے نکلے اور عذاب ہمارے
چھلکی چھلکی آنکھیں لیکن دل پایاب ہمارے

یہ کیا شہر کے پھول بھی پوچھیں، رنگِ بہار کی خصلت
یہ کیا خون ہمارا پہنیں خود احباب ہمارے

یہ کیا آدھے چاند پہ رونق، آدھے پہ تاریکی
یہ کیا، صبحِ تمنّا ان کی، شب القاب ہمارے

یہ کیا بہتے دریا آنکھیں، جلتے صحرا پاؤں
یہ کیا بجھ گئے اب کے دلوں میں بھی مہتاب ہمارے

یہ کیا تجھ سے پُوچھ کے اب مَیں اپنا حال بتاؤں
یہ کیا اپنا رزق بھی تیرا اور سیلاب ہمارے

یہ کیا جن کو دیکھنا چاہیں اور نہ دیکھیں ان کو
یہ کیا آنکھیں بھُول نہ پائیں، شب آداب ہمارے

یہ کیا مہر و محبّت نکلیں ، قہرِ دیار کے قصّے
یہ کیا آنکھ جو دیکھے اس پہ لبِ غرقاب ہمارے

یہ کیا کھینچ لی پاؤں تلے سے ریت بھی دریا نے
یہ کیا منزل پُوچھ رہی ہے ہم سے خواب ہمارے

میرا آنگن ، میری کھیتی ، مُجھ کم ذات سی اکھڑ
تم زندہ کہ ٹوٹ کے بکھریں کب اعصاب ہمارے

٭

اب کہاں رسمِ نجابت، خاک پہنا چاہیے
اس اکیلے گھر میں دیواروں کو ڈرنا چاہیے

خلعتِ شہزادگاں مقبول دیوانوں میں ہے
بے ضمیری کے سفر میں خود سے بچنا چاہیے

اب ہتھیلی پہ رکھی آنکھوں میں بینائی کہاں
اب تو احوالِ گزشتہ، کھُل کے کہنا چاہیے

بے سر و سامانیٔ جاں بھی مقدّر تھی مگر
شہر بھی پُوچھے تو اخفائے تمنّا چاہیے

اب تو مَوجِ خوں گزرتی ہے سروں کو کاٹتی
اب دُعاؤں کو بھی ہاتھوں سے چھلکنا چاہیے

بولنا بھُولا تو خوابوں نے بھی رُخصت مانگ لی
اب زبانوں پہ بھی انگاروں کو رکھنا چاہیے

بیڑیاں پہنی تھیں مَیں نے تم نے کیوں پردہ رکھا
گنبدوں میں قید آوازوں کو چکھنا چاہیے

خوف بھی دریا کا ہے اور مَوج بھی دریا کی ہے
قلزمِ خود رفتگی سے اب نکلنا چاہیے

---

ایک لمحے کی شناسائی کے تیور تھے عجب
پرسشِ غم اُس نے کی تو دل کے منظر تھے عجب

فرصتِ خوابِ تمنّا ڈھونڈتی آئی ہمیں
تھے مقفل سارے در، شہرِ مقدّر تھے عجب

تُو ہَوا کے ساتھ تھا تو گھر میں ٹھہرا کون تھا
لے گئے دیوار و دَر تک، یہ مسافر تھے عجب

سنگِ خواہش اُس کے اُجلے ہاتھ میں گویا ہُوا
اُس کی خُوشبو سے تو سارے گھر معطّر تھے عجب

زندگی اپنے تعاقب میں چلے گی کب تلک
بھر گئے خود ریت سے، دل کے سمندر تھے عجب

روئے گی، غم بانٹنے آئیں گے پھر دیوار و در
تھے وہی عیسیٰ نفس، تیرے ستمگر تھے عجب

سفر تمام ہُوا ، شب کے خواب لکھنے کا
صلہ بھی مانگے سمندر، حباب لکھنے کا

قدِ زوال تراشے ہے زخم سے پیکر
زمیں میں دَم نہیں، فردِ عذاب لکھنے کا

حروف بھی تو بیاباں ہیں صُورتوں کی طرح
زمانہ گزرا ، دُعا کے نصاب لکھنے کا

ہَوا بھی کہہ نہ سکے اُس پہ کیا گزرتی ہے
تقاضہ کرتی ہے دُنیا ، گلاب لکھنے کا

خزاں کو گود لیا یا اُجڑ گئیں گودیں
فسانہ ختم ہُوا ، ماہتاب لکھنے کا

پرندے صحنِ تمنّا کے سب اُڑا ڈالے
مگر ہے شوق ترا ہر حساب لکھنے کا

---

٭

ذہن نے اذیّت کے خواب کی بشارت دی
ہم نے دشمنِ جاں کو دعوتِ ارادت دی

کل خزاں درختوں نے اپنے ہاتھ پھیلا کر
دُردِ شوقِ فردا کو دعوتِ صلابت دی

ہم اسیرِ دشنامی ہو سکے نہ خود آگاہ
زندگی نے جی بھر کے فرصتِ خجالت دی

شب فروش چہروں نے غازۂ جنُوں پہنا
مصلحت نے ظلمت کو قامتِ قیامت دی

ساحلوں پہ دن نکلے، یہ نصیب کب ہو گا
پانیوں نے آنکھوں کو بے زمیں مسافت دی

گریہ کناں تھے شام و سحر اور خستہ شب
یہ زخم میرے ہاتھ میں آئے گزشتہ شب

دیکھا تو شہر بھر کی ملامت تھی رزقِ جاں
بہلانے آئی بھی تو وہی دِل گرفتہ شب

مَیں تجھ کو اپنی آنکھ سے باہر بھی دیکھ لوں
پیکر میں ڈھل کے آ تو سہی اے خجستہ شب

مَیں اپنے بام و در پہ لکھی جانکنی سہی
تُو بھی ہے زخمِ خواب مگر اے سرشتہ شب

اے عندلیبِ جاں یہی تمہیدِ گُل بہت
اپنے نصیب میں بھی تو ہو گی نہفتہ شب

---

زخمِ آشنائی کیا، اس سے بیشتر دے گا
پھر کھُلے کواڑوں کو چشمِ منتظر دے گا

رازداریٔ جاں بھی اس سے پُوچھ کر کی تھی
وہ کہ حرفِ خواہش کو قُربتوں کا گھر دے گا

رات بھر کی بیداری صُبح کِھل اُٹھی ایسے
جیسے دُھوپ کا آنگن وصلِ معتبر دے گا

مَیں تو اُس دریچے پہ اپنا نام لِکھ آئی
جس کا رُخ اُسے شب بھر دعوتِ خبر دے گا

اُس نے نام مانگا تھا ، مَیں نے ہونٹ بھیجے تھے
ہر جواب اُن سے وہ اب تو پُوچھ کر دے گا

دشتِ بے محبّت میں تشنہ لب یہ کہتے ہیں
سارے شہسواروں میں کون اب کے سر دے گا

بادِ بے جہت اب کے سارے گھر اُجاڑے گی
کن کے سر قلم ہوں گے کون نقدِ شر دے گا

سطوتِ تعلّق میں بے ارادہ آنے پر
صبر کے صحیفوں کو کس کے نام کر دے گا

وہ بھی ہے فسردہ سا ، مَیں بھی ہوں فسردہ سی
اے خُدا تُو کیسے ان پانیوں میں گھر دے گا

رات پھر بُلاوے کے آئینوں کو لائے گی
چاند اوّلیں سب کا دعوتِ سفر دے گا

مَیں نے اس کو چاہا تو ہو گئی زلیخا سی
ہاں یہی گواہی وہ مجُھ کو دیکھ کر دے گا

✻

علاجِ زخم بھی تھا بندشِ زباں کے عوض
ہمیں نے قید نہ مانگی مگر اماں کے عوض

نہ مانگیں شب کہ جسے چادرِ سحر نہ ملے
نہ پہنیں خلعتِ جاں، یارِ مہرباں کے عوض

زمیں پہ موسمِ خوں اس برس ہی آیا ہے
لگی ہے قیمتِ جاں، طلعتِ سناں کے عوض

خلا میں بیٹھ کے تنہائیاں بٹورتے ہیں
تلاش کرتے ہیں پہنائیاں، مکاں کے عوض

سراغ دیتا ہے لہجۂ شکستہ پائی کا
فراخئ لبِ احساس ہے زیاں کے عوض

وہ قیدِ کوہ میں رہ کے بھی شہر شہر میں ہے
ہوئی ہے ہم سخنی کارِ بے زباں کے عوض

ہر ایک شب وہ نئے پیرہن میں ظاہر ہو
تلاشِ شعلۂ جاں لب بہ لب فغاں کے عوض

وہ سرو قد بھی تو زنجیر ہو گئے ناہید
زمیں کو اوڑھ کے بیٹھے جو آسماں کے عوض

٭

شہر میں دیواریں تھیں اور دیواروں میں وہ تنہا تھا
خبر نہیں وہ شخص تھا کیسا، چہرہ اُس کا اچھا تھا

پہچانتا تھا دستک کو اور قدموں کی ہر آہٹ کو
بُجھے چراغ کو ہاتھ میں تھامے، دروازہ بھی کھولا تھا

گھر میں تھے بس سانس مرے اور خواب دھرے تھے طاقوں پر
اُس نے گیلے فرش پہ ٹھنڈے پیر گھما کے سوچا تھا

خواہش بھر کے پچکاری میں، من ہولی کب کھیلو گے
کُنڈی دروازے کی کُھلی تھی، چھت پہ دِیا بھی رکھا تھا

مہندی پیڑ تو سوکن گھر تھا، اُس گھر ہی دیوالی تھی
میرا گھر جیسے بالک کا ٹوٹا ہُوا کھلونا تھا

پچھلے برس کے خواب تو اب کے چوک میں بھی نیلام نہ ہوں
لوگ بسیں اس گھاٹ جہاں سے کل وہ دریا بہتا تھا

عمر میں اُس سے بڑی تھی لیکن پہلے ٹوٹ کے بکھری مَیں
ساحل ساحل جذبے تھے اور دریا دریا پہنچی مَیں

شہر میں اُس کے نام کے جتنے شخص تھے سب ہی اچھے تھے
صبحِ سفر تو دُھند بہت تھی، دُھوپیں بن کر نکلی مَیں

اُس کی ہتھیلی کے دامن میں سارے موسم سمٹے تھے
اُس کے ہاتھ میں جاگی مَیں اور اُس کے ہاتھ سے اُجلی مَیں

اِک مُٹھی تاریکی میں تھا اِک مُٹھی سے بڑھ کر پیار
لمس کے جگنو پلّو باندھے زینہ زینہ اُتری مَیں

اُس کے آنگن میں کُھلتا تھا شہرِ مراد کا دروازہ
کُنوّیں کے پاس سے خالی گاگر ہاتھ میں لے کر پلٹی مَیں

مَیں نے جو سوچا تھا یوں تو اُس نے بھی وہی سوچا تھا
دن نکلا تو وہ بھی نہیں تھا اور موجود نہیں تھی مَیں

لمحہ لمحہ جاں پگھلے گی، قطرہ قطرہ شب ہو گی
اپنے ہاتھ لرزتے دیکھے، اپنے آپ ہی سنبھلی مَیں

---

٭

تیرے بخشے ہُوئے زخم آنکھوں میں تھے اور دیوار خوش تھی
کل کے موسم کی خوش بختیوں پہ زمیں تیز رفتار خوش تھی

صحن میں لڑکیوں کو بُلا کے نہ گھر سے نکلنے کی تاکید کی تھی
دراڑوں میں سے جھانکتے ریزہ ریزہ مناظر کی یلغار خوش تھی

محبّت کے موسم میں باتوں کی بیلیں مہک مانگتی ہیں
ڈھونڈنے اس کو جائیں گے کہتے ہوئے طبعِ دشوار خوش تھی

اس کو خوشبو سمجھ لوں تو پہنوں گی کیسے، بٹھاؤں گی کیسے
یہی وسوسے تھے کہ دہلیزِ خواہش بھی اس بار خوش تھی

تری دلکشائی کا چھینٹا لگا تو گُلوں سے مُلاقات کو جی نہ چاہا
مرے چھوٹے قد کے مقابل درازی تری، قامتِ یار خوش تھی

خُدا نے کہا تھا مجھے خواب دے دو، زمیں کا خُدا میں تمھیں مان لوں گا
صدف ساز لمحوں میں آبِ تہہ سنگ جاگا تو ترغیبِ انکار خوش تھی

---

*

پھر ہم خواب کو زرد سمجھ کے روئیں شب زندانی ہوں
پھر گلِ لب کی بات نہ مانیں، سوختہ شوق کہانی ہوں

پھر ہم اس کو درسِ محبّت دینے خود دو زانو ہوں
پھر اپنے گھر کی دیواروں پر آپ ہی رقص نشانی ہوں

قطرہ قطرہ خواب چکھیں اور صحرا صحرا ہو جائیں
آنکھیں گیلی مٹّی جیسی ، اسودِ شب پیشانی ہوں

اُتریں جاذب بانہوں والے دُھوپ سے تپتے سینے میں
وقت بھی ٹھہرے دریا جیسا ، لوگ بھی خواب زمانی ہوں

پہلے بوسے کی یورش سے اب تک آنکھیں بوجھل ہیں
جب بھی دیکھیں اس کی جانب، منظرِ شب امکانی ہوں

رات بہت سوئے بھی نہیں تھے، پھر بھی خواب بہت دیکھے
باتیں کی تھیں اس لہجے میں جیسے اس سے چھپانی ہوں

پہلے اس کو دیکھا تھا، یا پہلے اس کو چاہا تھا
ایسی باتیں کیا سوچیں جب سب اقرار زبانی ہوں

---

روی

# اسیں بُریاں وے لوکو!

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر، دریا، سمندر، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
حفظ ، حفاظت دروازہ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ
گھر اُجڑے اور شہر آباد
یاد کسی کو نہ اپنا نام
کاغذ جیسی دُلہنیں
ردّی بن کر بک جائیں

داسی ، ملکہ ، گھر رونق
فرنی پہ چاندی کے ورق
پانی ، بھوک ، جلن خواہش
فردِ جُرم کی خوں بارش
دشتِ کی سیّاحی
خوابِ شفق کی جرّاحی

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہ ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مٹی اور مَیں
پیٹ سے سب کے اُبلے آگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ
دِل دروازہ
قلم سے جھٹکی سیاہی نشانی
کنگھی ، ٹوٹے بال ، کمائی

جھُوٹی روٹی، شُکر خدایا
جیوے سائیں، کیا سُکھ پایا
مٹّی گارا اور اینٹیں
سب ہیں جھُوٹی بُنیادیں
مٹّی کے سینے پہ مٹّی
مٹّی چاٹے بالک
مٹّی کھائے حاملہ
مٹّی آنکھ دِکھائے
مٹّی ذائقہ اور زبان
زبان، جیسے ترا نام
حرف کے سو بَن باس
بول بھی دُشمن
چُپ بھی دُشمن
چلو کہارو، ساجن آنگن
مَوت کے بعد ہی واپس آؤ
چلو کہارو!

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر، دریا ، سمندر، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
دیواروں پہ ناچے کاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ
خمیازہ
شہر شگفتہ، گھر نمناک
دل کیا ہیں زخموں کے چاک
نفرت کے سب انگارے
سیپارے
گھر والی ، من دیوانی
آگ لگے ، کھے دیوالی
تن پیاسی، گھر کی داسی
حسبِ اجازت ، کامنا
پانی کو بھی چھاننا

کمر، کنستر، جلا گوشت
پھول کھلے اور نکلے پوست
دن دوزخ اور شب شیطان
آدم خور رہیں انسان

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر، دریا ، سمندر، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
پور پور میں دیپک راگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
دِل کا غازہ
کنٹھی ، جامنی ، گیروے
رشتے ، بھونرے اور منکے
مکھن اور لوبان کی بتی
ہرنی آنکھیں کستوری

زعفران کے سُوکھے پھُول
گردن جھٹکو کہو قبول
محل ، اُداسی ، بیراگی
مَل آنکھیں ، تُو ہے جاگی
سُن سنّاٹا رگوں کا
جاگا ہے دھن گھروں کا
دریا کی تہہ میں بستی
سنگ بھی دریا کے بستی
نیزہ جیون کا لگے
ساگر ساگر یہ کہے
سُوئی ، ناکہ اور دھاگہ
یہ ہے جیون پو بارہ

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں

آنکھوں میں سپنوں کے بھاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
دِل شیرازہ
مٹّی نے پہنی سُرخی
سوئی خلقت ہے جاگی
کانچ کلائی کجروا
موتی ، نین بجروا
غوطہ اونچی لہر میں
گُڑ میٹھا ہے زہر میں
گیان دھیان کے سب استھان
بن جائے ہیں سب انجان
گھاس ، زمین ، زمین بھی گھاس
انگلی انگلی ، سو سو پھانس
پَوَن جھکورا ، خواب کا
باب کھُلا سنجب کا

فرد، اکائی، اکلاپا
لہر، دریا، سمندر، لہر
پانی، مَیں اور مَیں
لال سندوری چمکے مانگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
شب اندازہ
عُمر کی کُنڈی
کھولے کھڑکی
برف، ہَوا، بارش، طوفان
جاگیں ڈر ڈر کے انسان
رشتہ، روئی
جذبے، چرخی
کاتو پُونی
پُونی کاتو
کپڑا، چادر، بہلاوا

چھُپ کے مِلنے کا رستہ
رزق ، دُعا ، دیوارِ شجر
ہنسلی ، پھندا ، ڈر ، گھر گھر
بھٹی ، بھُرتا ، بھاونا
شیشے میں یوں اُتارنا
شیر بھی گھاس کو کھا جائے
آگ پہ چل کے خود آئے
دُودھ سفیدی سے عاری
خوف سے چہرے پچکاری

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
سیج بنے پھولوں کی آگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ

گھر شب غازہ

صاحب بی بی اور غلام
سب کے دام
بی بی ، غلام
بس ایک سے کام
شیلف ، سجاوٹ ، دوپہر
شام کو آتشدان میں آگ
چہرے لال، بہت ہی لال
گھنگھٹ پٹ کھلے اور در بند
ناچے خون کا انگارہ
گاتا جائے بنجارہ
مذہب ، دنیا اور اللہ
جیون کی یہ دُر گھٹنا
بات میں شب کا ذائقہ
ہُنر میں زہر کا قاصدا

طوطے میں جیون رُوپا
جنگل میں ڈھونڈے دلوتا
حق اللہ طوطے کی رَٹ
کنوئیں پہ چلتا رہے رہٹ
انجن دُھواں نکالے جائے
بادل ہَوا ، اُڑائے جائے
بند ، بندھے کِس کنارے
پار اب کون اُتارے

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، مَیں اور مَیں
خواب گئے آنکھوں میں جاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر مَوت کا آوازہ
لب ہیں تازہ
شبتو ، شاخ ، شجر ، سمن

مہندی ہاتھ اور پھول لگن
دِل کا حال کبوتر سا
کوندا مارے جی ڈر کا
نرگس سی اُس کی مرضی
دُنیا پھیلے وہ سمٹی
لشکر، لشکر وہ بجنے
پیاسی دریا سی رہیے
خیمۂ جاں، دھجّی دھجّی
شیشۂ دِل، کرچی کرچی
نخلِ تمنّا، برگِ خزاں
وصل کا لمحہ، وہم و گماں
قند تو کیا گلقند بھی زہر
ایک ہیں اب تو جنگل شہر
دیکھ کے زرد ہو زعفران
آنکھوں کو بھولی پہچان

اوس سے پیاس بجھے گی کب
جاگے گی شب مجرئی کب

فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، میں اور میں
چاہے دیکھو سکھ بھی تیاگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ
غم خمیازہ
کالی پکی جامنیں
لگے ہیں لڑکیاں رات میں
بانس کے جنگل جوانیاں
کچا ، کٹورا کہانیاں
میٹھے آڑو کے غنچے
دل میں کوندا سا لپکے

آنوچے کے پھول بھی پیازی
سندر لاگے آتش بازی

کالی بیل کے کالے پھول
آنکھیں، ہاتھ، تمنّا، دھول

عورت جب جل جائے ہے
کڑوا کٹھل بن جائے ہے

سُورج سے لکھے بپتا
پانی سے ڈھونڈے رشتہ

دکھ سے بُنے خیالوں کو
خود ہی تانے جالوں کو

نالی میں خوں کا چھینٹا
پنکھے سے لٹکا پھندا

پانی پہ ٹھہری کائی
خاموشی ہے سچّائی
خواہش کرتے کمر جُھکی
زینہ زینہ جاں نکلی

پیر دباتے شب گزرے
گھونسے کھاتے دن بیتے
فرد ، اکائی ، اکلاپا
لہر ، دریا ، سمندر ، لہر
پانی ، میں اور میں
گائے دِل اب یہ بیراگ
باہر بیٹھا کالا ناگ
اندر موت کا آوازہ
دل غم سازہ
کلموہی اور نصیبوں جلی
سُنتے سُنتے گھر میں پلی
ڈر ڈر دیکھا بدن کو
گندا سمجھا لگن کو
بن بر دیکھے بیاہی گئی
میں سوچوں میں چاہی گئی

پگڑی، پیچ بنے چاہت
لوگ کہیں ہیں دسراہت ۔

گھر کایا دیواروں سے
بات کروں انگاروں سے

پتّھر پیٹ جنے نکلے
ساتھی بھی سائے نکلے

لیے سفیدی بالوں کی
صحرا شرط، غزالوں کی

---

# خود کلامی

مجھے سزا دو

کہ مَیں نے اپنے لہُو سے تعبیرِ خواب لکھی

جنُوں بریدہ کتاب لکھی

مجھے سزا دو

کہ مَیں نے تقدیسِ خوابِ فردا میں جاں گزاری

بہ لطفِ شب زادگاں گزاری

مجھے سزا دو

کہ مَیں نے قاتل کو وصفِ تیغ و عَلَم سکھایا

سرِ دار کو اوجِ قلم سکھایا

مجھے سزا دو

کہ مَیں عدُو کی صلیب کی محتسب رہی ہوں
ہَوا کی زد پہ جلے چراغوں کی روشنی ہوں
مجھے سزا دو
کہ مَیں نے دوشیزگی کو سودائے شب گماں سے رہائی دی تھی
گھروں کے بُجھتے دِیوں کو شانِ خدائی دی تھی
مجھے سزا دو
کہ مَیں جیوں تو تمہاری دستار گر نہ جائے
مجھے سزا دو
کہ میرے بیٹوں کے ہاتھ اُٹھے تو تم نہ ہوگے
کہ ایک بھی تیغِ حرف توسِ میاں سے نکلے تو تم نہ ہوگے
مجھے سزا دو
کہ مَیں تو ہر سانس میں نئی زندگی کی خُوگر
حیات و بعدِ حیات بھی زندہ تر رہوں گی
مجھے سزا دو
کہ پھر تمہاری سزا کی میعاد ختم ہو گی

# پہلی پیاس اور آخری گھونٹ

محبت کے آراستہ

مینا بازار میں

مری خواہشیں بک رہی تھیں۔

تعلق کی خواہش

کہ جو جنس کی واگذاری میں

صَرفِ جہنم ہوئی

دیکھنے میں مگر سطوتِ شب ہوئی۔

تبسّم کی خواہش

ملالوں کے کہنہ خرابوں میں

مکڑی کے جالے کی صورت

لبوں پہ تتی
مگر تتلیوں نے عجب رنگ چھوڑے
کہ یہ کھنگی وجہِ حیرت ہوئی۔
تکلّم کی خواہش
ہوا نے فضاؤں میں جو لفظ لکھّے
وہ آہنگ و لہجے میں تبدیل ہو کر
زماں آشنا داوروں کے لیے
قلزمِ خوں بنی۔

مگر ایک خواہش
جسے بیچنے کی تمنّا
نہ اُن کو کہ جو بیچتے ہیں
نہ مجھ کو کہ جو بک رہی ہوں۔
کباڑی کی دُکان میں
بے ضرورت بھری بوتلوں کی طرح
بے وقعت سنگریزے

تمنّا کے نیزے سے۔
کبھی قفلِ اُمید کی کھوئی چابی
مِلے گی اسی غم زدہ ڈھیر سے۔
آؤ اندھوں کی صُورت ٹٹولیں
کہ اب جانیں کب روشنی ہو!

# انبوہی

# گلاس لینڈسکیپ

ابھی سردی پوروں کی پہچان کے موسم میں ہے
اس سے پہلے کہ برف میرے دروازے کے آگے دیوار بن جائے
تم قہوے کی پیالی سے اُٹھتی، مہکتی بھاپ کی طرح
میری پہچان کر لو
مَیں ابھی تک سبز ہوں
مُنہ بند الائچی کی طرح۔
مَیں نے آج، تمہاری یاد کے کبوتر کو
اپنے ذہن کے کابک سے آزاد کیا
تو مجھے اندر کی پتاور دکھائی دی۔
چاند پُورا ہونے سے پہلے تم نے مجھے چُھوا

اور بات پُوری ہونے سے پہلے
تم نے بات ختم کر دی۔
جانکاری کے بھی کتنے دُکھ ہوتے ہیں
بن کہے ہی تلخ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔
اچھی بات کو دُہرانے کی سعی
اور بُری بات کو بُھلانے کی جدوجہد میں
زندگی بیت جاتی ہے۔
برف کی دیوار ہیں
اب کے مَیں بھی چُنوا دی جاؤں گی
کہ مجھے آگ سے کھیلتا دیکھ کر
دانش مندوں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔
مَیں تمہارے پاس لیٹی ہوئی بھی
پُھلجھڑی کی طرح سُلگتی رہتی ہُوں۔
مَیں تم سے دُور ہُوں
تب بھی تم میری لپٹوں سے سُلگتے اور جُھلستے رہتے ہو۔
سمندر صرف چاند کا کہا مانتا ہے

سرِ شام جب سُورج اور میری آنکھیں سُرخ ہوں
تو مَیں چاند کے بُلاوے پہ سمندر کا خروش دیکھنے چلی جاتی ہوں
اور میرے پیروں کے نیچے سے ریت نکل کر
مجھے بے زمین کر دیتی ہے۔
پَیر بے زمین
اور سر بے آسمان
پھانسی پر لٹکے شخص کی طرح ہو کے بھی
یہی سمجھتی ہو
کہ مُنہ بند الائچی کی طرح ابھی تک سبز ہو

# سمندر تو ایک آنسو ہے

آنکھیں کھولتی اور بند کرتی گڑیا کی طرح
مَیں نے زندگی کے سارے منظر دیکھے ہیں۔
کٹے درخت کی سُوکھی جڑ کی طرح
میرے زمین سے وابستہ رہنے پر
کسی کو اعتراض نہ تھا۔
بیچ دوپہر میں اندھیری رات
میرا مقدّر تھی۔
آدھی رات کے بعد کی بارش
کہ جس کی کسی کو خبر نہیں ہوتی ہے
میری آنکھوں میں تھی۔

آنسوؤں کی سیڑھیوں سے
مَیں قطرہ قطرہ نیچے اُتری تھی
اور آتشدان میں جلتی
لکڑیوں کے بیچ مُسکرا رہی تھی۔
میری ہڈیاں بھی میرے اندر بولتی ہیں۔
مجھے گزشتہ غموں کو رخصت کرنے سے
اتنی فرصت بھی نہیں مِلتی ہے
کہ مَیں تازہ غموں کا شمار کر سکوں۔
مَیں نے کاغذ پہ اپنے لیے کتنے ہی سُورج بنائے
مگر رات نے مجھے پہنے رکھّا۔
رات کی دیواریں بہت اُونچی تھیں
اور دروازے لوہے کے تھے۔
مَیں نے کہانی شروع کی تھی
مگر کسی نے مجھے ختم کرنے نہیں دیا۔
صحرا میں چیلوں کے پروں کی طرح
میرے دل کی دھڑکن نے

میرے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے گیت کو
آنسوؤں میں بدل دیا ہے۔
سمندر اور میں
ایک دوسرے کا خروش سُن کر
خاموش ہونے کے لیے، وصال چاہتے ہیں۔

۵۵،

# خلوتِ زخم

خوابوں کو چھانتے چھانتے
اب تو افواہیں بھی مرنے لگی ہیں
یہ سب موسم کا قصور تو نہیں
کہ درخت بھالے، اور دریا کائی لگتے ہیں
معلوم نہیں غلطی پہلے مجھ سے ہوئی تھی کہ خدا سے
کہ مَیں آگ کے بطن سے پیدا ہوئی۔
مَیں ہر روز کیلنڈر سے سودے بازی کرتی ہوں
آگ کو پھول بنانے کی،
مگر میرے جوتوں کی گھستی ایڑیوں
پر رکھے تلوے

اور بھی کُھردرے ہو چُکے ہیں۔
میری طرح پیاسی کھڑکیاں
پھُولوں سے لدی شاخوں کی مہکار کی منتظر ہیں۔
گھوڑوں پہ سوار ہو کے جانے والوں کو
آشیرباد مِلتی تھی۔
ہم جو روز بسوں کے کنڈوں کے ساتھ
لٹکنے کے لیے نکلتے ہیں،
ہماری تو خالی جیب بھی کٹ جاتی ہے
اور ہمارے بدن کا کوئی چیتھڑا
سولھا گز لٹھے میں لپٹنے کو گھر واپس آجاتا ہے۔
جس کے پاس بس کا کرایہ نہ تھا
اُن کے گھر لٹھا کیسے آئے گا!
یہ کتابوں میں نہیں لکھا ہے۔
باہر سیلاب ہو
اور کوٹھے پہ چڑھے لوگ پیاسے ہوں
تو کیا، کیا جائے

-۷۵-

یہ کتابوں میں نہیں لکھا ہے
سمندر کی طرح میرے اندر بھی
کتنے ہی خوابوں کے جہاز ڈوب گئے ہیں
یہ بھی کتابوں میں نہیں لکھا ہے۔
مجھے کتابوں کے حوالے نہ دو
کہ جرابیں پہن کے چلنے والی قوم
نقش قدم نہیں چھوڑتی

---

# بجھتے بدن کی نیلاہٹ

ایک سچ جو سب کو معلوم ہے
اس کے بتانے میں حرج بھی کیا ہے
ساحل پہ ٹھہرے ہوئے ہر جہاز میں
نہ مسافر بیٹھتے ہیں نہ خزانہ ہوتا ہے
پھر بھی جب زمین سانس لیتی ہے
تو لہریں ان کھوکھلے اژدھوں کو بھی نہال کر دیتی ہیں
پہاڑیوں کے درمیان رہ جانے والے بادل
برسا نہیں کرتے ہیں
کہ دریا کے سوکھتے سوکھتے
درختوں پہ پتے کم اور چڑیاں زیادہ۔

ہو گئی ہیں۔

زمین کی بھوک اتنی بڑھ گئی ہے

کہ جو بیج ڈالو، وہ کھا جاتی ہے۔

ہر دفعہ جب بھی میرے حصے کی دھوپ کا وقت آیا

سورج کے سامنے بادل آ گیا۔

میری کمر دوہری ہونے تک

خواہش کا سایہ میرے پیچھے رہا۔

آسمانوں پہ چمکتی بجلی

جب بھی میرے دل میں کوندی

میرے آنکھوں میں ٹھہرے خواب جل گئے۔

پہلے پہل خواب تتلیوں کی طرح ہوتے تھے

پھر انہوں نے قوس و قزح کا رنگ لیا

اور اب ڈوبتی شام کی شفق پہنے

میری پرانی کتابوں کی

پھٹی ہوئی جلد کی طرح پھٹی ہوئی ایڑیاں لیے

کتابوں کی پچھلی شیلف میں

کہ جہاں نہ کام آنے والی کتابیں رکھی جاتی ہیں
صرف محفوظ ہیں۔
کس سمت جائیں
کہ جس سمت بھی چلو سامنے دیوار آجاتی ہے
وُہ دیوار جو مَیں نے نہیں بنائی
وُہ دیوار جو میری حفاظت نہیں کرتی
وُہ دیوار جو مجھ پر آن گرتی ہے

---

# زہر کا ڈنک

مَیں نے آگے جانے والی شاہراہ پر
پیچھے چلنا شروع کر دیا ہے
اور سُورج میرے کپڑوں کے راستے
مُجھ میں تپش منتقل کر رہا ہے۔
سفید رنگ کے کپڑے جو میرے وجود کا
رنگ جذب کر کے، پیلے پڑ چُکے ہیں
واپس آنے والے راستے کا
ساتھ کیسے دیں گے!
مگر سُنو
گلاب کی سُوکھی شاخ کو کاغذ میں لپیٹو

میرا وجود بن جائے گا
کوٹ کی خالی جیب کو باہر نکال کے جھاڑو
میرے سارے لفظ مجسّم ہو جائیں گے
پھٹے ہُوئے بُوٹ سے جھانکتی زخمی انگلی دیکھو
میری ہنسی یاد آ جائے گی
آدھی رات کو اُٹھ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو
میری آنکھوں کی بے خوابی تمہاری غنودگی میں جاگ رہی ہوگی
کتابوں میں مَری ہُوئی مکڑیوں کی طرح
تم میری ذات کو اُٹھا کر باہر کیسے پھینکو گے
کہ ہزیمت کے جالے تمہاری آنکھوں پہ تنے ہوئے ہیں

# آگ کا رقص

دریا کی طرح اب میرے دل کی تہہ میں
ریت بھر گئی ہے
وہی جو پہلے میرے بالوں
اور میری آنکھوں میں تھی۔
کبھی لفظ میری تمنّا کی کشتی بن کے
خوابوں کے دریا پار کر جاتے تھے
ہَوا بادلوں کو لپیٹ لیا کرتی تھی
اور رات چاند کو عُریاں کر دیتی تھی
ستاروں اور چاند کی عریانی نے
مجھے حُسنِ بدن کی تقدیس سکھائی تھی

مَیں نے اُس وقت تک ہَواؤں کا نوحہ نہیں سُنا تھا
مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ ہَوائیں نفرتوں کے بیج لیے
میرے صحن سے گزر رہی ہیں۔
اب مَیں اپنے اندر کے وحشی کو
تنگ قمیصوں، کَسے ہُوئے بلاؤزوں
اور ہائی نیک کے سوئیٹروں میں قید کرنا چاہتی ہوں۔
میں نے سر جھکانے کی عادت ڈالنے کے لئے
نماز پڑھنے کی بھی کوشش کی
مگر جُھکنے سے مرے زخموں کے ٹانکے ٹُوٹ گئے۔
ہونٹ کاٹنے والے، ناخن کترنے والے
سگرٹ اور شراب پینے والے
اور لڑکیوں کی لذّت میں بدمست رہنے والے
سبھی لوگ اچھے ہیں
کہ اپنے اندر کے کیسلے آدمی کو پیرہن
تو دے دیتے ہیں۔
اسمان سے رزق دینے والے کو خُدا

اور زمین پہ رزق دینے والے کو مجازی خُدا کہنے والوں نے
مجھے یہ منطق نہیں سکھائی
کہ سردیوں میں آگ کے گرد ناچنے والوں کی
آنکھوں کو رزق دینے والی کو
کس زمانے کا خُدا کہا جائے گا!

---

# تمہاری خاموشی ۔ میرا جُرم

بدسلوکی ، آکاس بیل کی طرح
میرے وجود کو چُوس رہی ہے ۔
والٹ وٹمن نے کہا تھا
نیچ لوگوں کی اولادیں
اپنی ماؤں سے بدسلوکی کرتی ہیں ۔
ہم تیسری دُنیا کے لوگ
سب نیچ لوگ ہیں
کہ ہماری مائیں ، ہماری بیٹیاں
ہماری بیویاں ، ہماری بہنیں
صرف غرض اور ہوس کی بھٹی کا ایندھن ہیں ۔

لوگوں نے تمہارے ہاتھوں پر بھی
محبّت کی سُرخی دیکھی ہے
مگر مَیں جانتی ہوں،
میرے مُنہ پہ تمہارے تھپّڑ نے
میری غیرت کا سارا خون مرتسم کر دیا ہے۔
اب بھی مَیں خود کو غیرت مند کہتی ہوں
بدسلوکیوں پہ لال بھبھوکا ہو کے
اپنی نسوں، اپنی رگوں اور اپنی باتوں کو
زندہ ہونے کا یقین دلاتی ہُوں۔
کہیں سے پوتا مٹّی مِلے
تو تڑختے ہُوئے جسم پر لیپ کر کے
یہ عیب تو چُھپا لوں۔
اب تو سوچ کے کُنڈے میں لٹکی
نمائشی مسکراہٹ کا ہیرا
چُور چُور ہو چُکا ہے۔
کیا مَیں اُسی عمر کی سمت لوٹ جاؤں

جہاں بچّے کو بولنا نہیں آتا
کہ اب پلٹ کے دیکھنے والا پتّھر بھی نہیں ہوتا
مَیں نے بیج ڈالا
فصل بھی اُگائی
مگر فصل کی کٹائی میرے مقدّر میں نہیں تھی
کہ بدسلوکی کی درانتی نے
میری آنکھوں میں سلائیاں پھیر دیں تھیں۔
خنجرِ بے نیام ہو کے بھی زنگ آلود ہُوں۔
تم اس دریوزگی کو روایت کے
کس جُزدان میں لپیٹو گے
کہ میرے ہلکان ہوتے جذبوں کی مسیحائی ہو سکے

# سُورج، سوا نیزے پر

شہر اور مُلک بدلنے کے خیال کے آنگن میں
دیواروں پہ چاندنی اور صحن میں اندھیرا ہے
مَیں تو صحن میں ہوں
دیواروں پہ صرف میرے سر کا سایہ نظر آتا ہے
سر کوئی بھی ہو، سایہ ایک جیسا ہوتا ہے
مگر چیونٹیوں کی قطاروں کا سایہ تو نہیں بنتا ہے۔
کہتے ہیں جس کا سایہ نہ ہو وہ عظیم ہوتا ہے
وہ خواب جو ہم نے رزق کے نام پہ دیکھے تھے
ان کا سایہ بھی نہیں ہے،
تو کیا خواب کی عظمت پہ ایمان رکھتے ہوئے

بھوک کو زندگی سمجھ لیں
غلام کب سمجھتا ہے کہ اُسے غلام بنایا جا رہا ہے۔
یہ تو دوسروں کو علم ہوتا ہے
مگر نہیں، بیاہی ہونے کے باوجود مطلقہ عورتیں
اب بھی اپنے اپنے گھروں میں بظاہر آباد نظر آتی ہیں۔
دیواروں پہ سروں کے سایوں کی طرح
شاید ان کا بدن عظیم ہے
اور ذہن غلام

# تثلیث

مَیں اُس راستے سے گُزرتی ہُوں
جو پہاڑوں کی آماجگاہ ہے۔
مَیں اس آواز کو سُنتی ہُوں
جس کا خمیر بُزدِلی اور خوف ہے۔
مَیں اس شخص سے مِلتی ہُوں
جس کی رگوں میں خون بھی برف ہے۔
یہ میرا اپنا انتخاب ہے
ریت بھی نامرادی کی چادر اوڑھے
پہاڑ بنی تھی
آواز اور شخص

ہری اپنی بازگشت ہیں
زگشت تو زندگی بھی ہے
. میرا انتخاب نہیں

# کھڑکی کے اندر کا منظر

کہیں تمہارے گھر میں مرے ہونٹ رہ گئے تھے
تم کو بھی نہیں پتہ چلا نا!
ہاں بلاٹنگ پیپر کے رنگ کی کوئی چیز
کہ جو ہر رنگ جذب کر کے بھی شگفتہ و تازہ
اور اسی طرح گلابی تھی
تمہیں اپنا نام نہ بتا سکی۔
سُنا ہے تم نے میرے ہونٹ اُٹھا کر
جیب میں رکھ لیے تھے
مگر ظاہر رہنے والی چیز چھُپی کیسے رہے!

# نیند میں لپٹے شہر کے نام

مجھے گُنہ میں زندہ رہنے دو
کہ میں نیکی کا نام لے کر
سراب آلود زندگی بسر کرنے سے بیزار ہوں۔
دھندلے شیشوں کے باہر کچھُ نظر نہیں آتا
مگر شیشہ پھر شیشہ ہوتا ہے
ذرا سی ضرب سے چکنا چُور ہو جاتا ہے۔
میز پر پڑی گرد صاف کرتے
اور گرد آلود ہاتھ دھوتے دھوتے
مَیں تو خود گرد جیسی ہو گئی۔
نکلتا اور ڈُوبتا سُورج اُفق پہ ایک جیسا لگتا ہے
— — — —

## صرف شعاع کا فرق

اُفت و خیز کا فرق بن جاتا ہے۔
تم بھی سمندر کی طرح
پتھروں کو اور زندوں کو
اُٹھا اُٹھا کر پھینکتے ہو،
سمندر اپنی مسلسل بے خوابی سے نالاں ہے
وہ اپنی وسعتوں کو سمیٹ کر کسی کے سپرد نہیں کر سکتا
یہی اُس کا المیہ ہے
یہی اُس کا خواب ہے۔
میرے خواب بھی سمندر جیسے ہیں
تم اور مَیں،
سمندر۔ سمندر
بول میری مچھلی کتنا پانی

---

# حضرتِ نوح کے زمانے کی کہانی

بدنمائی نہیں دیکھنی چاہتے ہو
تو ایک آنکھ بند کر لو
اب بھی نظر آتی ہے
تو دوسری آنکھ بھی بند کر لو
دلخراش آواز سُنائی دیتی ہے
تو دونوں کان بند کر لو
کہ کانوں میں گونج رہ جائے
تو کان کھولنے کی ہمّت ہی نہیں رہتی ہے
طوفان آنے کا خدشہ ابھی بہت دُور ہے
فلڈ کنٹرول سیل کام کر رہا ہے ،

پانی کی زیرِ زمین گزرگاہوں کو
بند کرنے کا ،
کاغذ پہ لکھی تحریر منع ہے تو
پتّوں کو پڑھ لو
کہ زمین بھی تو انسان کو شراب کی طرح
پی کر مدہوش ہونے کا شوق رکھتی ہے

# تیرے پیچ — میری ڈھیل

مجھے علم ہے تمہیں پتنگ کاٹنے کا بہت شوق ہے
میری پتنگ فضا میں اکیلی نہیں
اور بھی بہت ، رنگ برنگی پتنگیں
فضا میں لہرا رہی ہیں
میری ڈھیل دیکھ کر تم نے سوچا تھا
اتنی ڈور پہ پیچ پڑیں
تو پتنگ نہیں سنبھلتی ہے۔
مجھے یہ علم تھا کہ میری ڈھیل اور میری اُڑان
نئی پتنگوں والوں کو
شوقِ رزم آرائی میں اُڑائے لیے جا رہی ہے

آؤ کہ کُھلی فضا کا معرکہ
رجز بن کے گونجتا ہے۔
مجھے معلوم ہے
میری ڈور پہ میرے ناخن اور میرے دانت
گِھس کر لگائے گئے ہیں
اور تمہاری ڈور پہ
دیواروں پہ لگے حفاظتی شیشوں کی ٹکڑیوں کو بھی
پیس کر لگا دیا گیا ہے۔
اپنے آنگن سے جھانکتے آسمان کے کنارے کو
مَیں اپنے پتنگ سے ڈھک دیتی ہوں
اور تم دوسروں کی چھتوں پہ کھڑے ہو کر
پتنگ اونچی کرنی چاہتے ہو!
مَیں تو یہ سوچ رہی ہوں
تمہاری پتنگ کٹے گی تو تمہارے مانجھے سے
لوگوں کے سروں کی چادریں نہ کٹ جائیں
گردنیں نہ کٹ جائیں

بس اسی لیے
مَیں اپنی اُونچی پتنگ کو اور ڈھیل دیتی جا رہی ہوں

## تخمِ خوں

چاند کی شکل کے
چاندی سے روپے
بنک بھی لینے سے انکار کرتا ہے
اور چاندی سے چہرے
انگیٹھیوں پہ کٹورے، گلاس اور پلیٹیں سجائے
خوشبو میں بسے
مہک کے خواب لانے والوں کا
انتظار کر کر کے
چاندی ہو گئے ہیں۔
میرے چہرے کی طرح کے سفید ململ کے رومال

اب کوئی استعمال نہیں کرتا ہے
وہ زیتون کے پھول جمع کرنے والی لڑکیاں
کہ جن کی کمر میں ہوائیں ہاتھ ڈال کر
اپنائیت کا احساس دلاتی تھیں
وہ اب بھی کوری ململ کی طرح ہیں۔
پیوند، لقمہ، گھونٹ
کیا زندگی یونہی نبٹے گی!
بچپن میں ہم چلنا سیکھتے ہیں
اور سب اس بات پر ناز کرتے ہیں
کہ ہم اپنے پیروں پر چل سکیں
مگر جب جوان ہو جائیں
تو دوسرے اپنے پیروں کے نقوش پر چلا کر
ہماری اپنی چلنے کی حس مار ڈالتے ہیں۔
ہوا نے زہر بارات سجائی ہے
ہر گھر میں دمکتی لو کو زنجیر کرنے کا آخری حربہ،
چڑیاں پتھرا رہی ہیں

اور درختوں کے اندر
بانسریاں بج رہی ہیں
اس سے پہلے کہ ہوا پہاڑوں پر دم توڑ دے
لہروں میں چمکتی روشنی کی آخری کرنوں کو
زنجیر کرلو!
شیشے پہ گری ہوئی پھول کی پتّیاں
زندگی کی آخری نشانیاں ہیں

---

# پَر کٹے پرندے

سُنا

وُہ کہتے ہیں کہ کٹی ہُوئی شاخوں کے درختوں پہ
چڑیاں آکر نہیں بیٹھتی ہیں
نہیں چہچہاتی ہیں
تمہارے کٹے ہُوئے بالوں کے شجر پہ
میری آرزو کی چڑیاں کیسے بیٹھیں
کیسے چہچہائیں

سُنا

وہ کہتے ہیں دُھواں دیتی آرزوؤں کے زنداں میں

پھول کھلنے کا موسم نہیں آتا ہے
تمہارے دانتوں کے زنداں میں
میری زبان کو ذائقہ نہیں ملتا ہے
میرے خواب کو راستہ نہیں ملتا ہے

سُنا
وُہ کہتے ہیں
خُدا بنتے انسانوں کے بیچ
خُدا کبھی نہیں آتا ہے
کبھی مہرباں نہیں ہوتا ہے
تمہاری آنکھوں میں خُشک سالی کا موسم
ہونٹوں پر پپڑیاں بن کر جم گیا ہے
خون آنکھوں سے بھی کم گیا ہے

سُنا
وہ کہتے ہیں
آنکھ بھی سب کچھ دیکھنے سے ڈرتی ہے

ہمیں

درخت چلتے ہُوئے اور گاڑی ٹھہری ہُوئی معلوم ہوتی ہے۔

نہ کہیں قیام نہ کوئی فاصلہ،

کہ جس کو طے کریں

تو خُشک سالی کا موسم ختم ہو

# بند مٹھیاں — بھنچے ہونٹ

آنگن کی دیوار کی ایک اینٹ اُکھڑی
تو بچّوں نے خالی جگہ کے سہارے
ساری اینٹیں اُکھاڑ ڈالیں ۔
گلی کے سارے رستے
کسی کے بیاہ کے جشن میں بند تھے ۔
مُجھے پتّھروں پہ چل کے دریا کنارے جانا پڑا
دریا میں سارا شہر اُلٹا نظر آرہا تھا
گھروں کی چھتیں دریا کی تہہ میں نظر آرہی تھیں
کیا یہی اصل ہے !
اصل تو یہ بھی نہیں کہ مَیں ، مَیں ہُوں

ہم سب ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں
اور نہ ایک دوسرے کو مار ڈالتے ہیں۔
آنکھوں کو قتل گاہ سے فیض یاب کرنے کے لیے
ہم بائبل کی تلاوت کرتے ہیں۔
وہ دیکھو درخت کی ایک شاخ
دیوار پھاڑ کر ادھر آنکلی ہے
کہ موت کے بستر پر درختوں کے خواب
مجھے جگا رہے ہیں

---

# اے رات تُو بتا!

دوستی کی صُبح طلوع ہو تو
آنگن میں گزشتہ کے سُوکھے
پتّوں کے ڈھیر تلے
سانس لیتی کونپل کی رُونمائی ہو۔
زندگی کے سمندر میں تو
لوگ رات سے دوستی کا رشتہ
باندھا کرتے تھے
اندھے جہازوں کو رستہ دکھاتے تھے
اور گھروں کی دیواروں پہ
چراغ جلا کر

انتظار کا تعویذ پہن کر
مجسّم دُعا بن جاتے تھے۔
اس زمانے میں
گھروں سے نکلنے والوں کو
شک کی وردی نہیں
درویشی کی قبا پہنائی جاتی تھی۔
اُس زمانے میں میرے گنہ کا شاہد
بس میرا خُدا ہوتا تھا
کہ پردے رکھنے کی گواہی
کبھی انحراف میں تبدیل نہیں ہوئی تھی۔
اُس زمانے میں بھی
اگر دس بجے رات کے بعد گھروں سے نکلنے والوں کی
تلاشیاں لی جاتیں
تو پھر
ستاروں کے ذریعے راستہ تلاش کرنے والے
منزل پہ کیسے پہنچتے

ہمیں بھی منزل اسی لیے نہ ملی
کہ ہم ستارۂ سحری کی صداقت
کی گواہی نہ بن سکے
اور سوتے رہے۔
ہمیں بھی منزل اسی لیے نہ ملی
کہ کوتوالِ شہر
خود اپنی تلاشی کے خوف سے
گھروں سے باہر نکل کر
خلقت کی ڈیوڑھیوں پہ
مفلسی کی ڈائنوں کا رقص نہ دیکھ سکے۔
قیامت کے دن
جب ہم اپنی اپنی قبروں سے اُٹھائے جائیں گے
تو ان حق تلفیوں کا کفّارہ کون ادا کرے گا

---

## روزنامچہ

میرے ہر آج کو گزشتہ بنانے والوں نے
اپنے ناموں کے سامنے اوصاف
اور میرے نام کے سامنے دُشنام لکھی ہے۔
میری تاریخ کو زنجیر پہنانے والوں نے
میرے گھر کے سامنے سلاخیں
اور اپنے گھر کے سامنے
عشق پیچاں کی بیل سجالی ہے۔
میری گویائی کو تصویر بنانے والوں نے
اپنے لیے لونگ پلے
اور میرے لیے کنویں بنالیے ہیں۔

سروں کے ڈول سے
گویائی کی رسّی باندھ کر
سچائی کا پانی بھرنے
پنہارنیں کب آئیں گی!
کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد
دُنیا میں مرد کم ہو گئے تھے
تو عورتوں نے ہی چمنی چمنی
دھوئیں کے بادلوں سے
خوشحالی کا مینہ برسایا تھا۔
امن کا میگھ
خوش حالی کا مینہ،
اندھی اور دیکھنے والی آنکھوں سے نکلتے آنسو
بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔
اِن ہاتھوں کو بلند رکھو
کہ نیچے آئے
تو بریدہ ہوں گے

ان ہونٹوں کو مصروفِ گفتار رکھو
کہ خاموش ہوئے
تو سی دِیے جائیں گے۔
سنو!
آگ کو آگ نہیں بجھا سکتی

۹۵ء

# آخری فیصلہ

کانٹوں کی چٹان پہ کھڑی
مَیں آنکھوں کی سوئیاں نکال رہی ہوں
یہ علاقہ کِس سلطنت میں شامل ہے۔
ملوکیت، میری زبان پہ کانٹے
حلق میں پھندا
آنکھیں باہر،
شاہ بلوط کے لمبے درختوں جیسے
لمبے پُوت، بہت ہو گئے ہیں۔
جنگل میں درخت زیادہ ہو جائیں
تو آگ لگا کر درخت کم کر دِیے جاتے ہیں

باہر نکلی ہوئی آنکھ سے زعفران کا کھیت
اور کٹے ہُوئے بازوؤں سے گنّے کی پوریاں بن گئی ہیں۔
ہم نے ایک جھُوٹ بولا تھا نا!
اب ساری عمر اُس کو سچ ثابت کرنے میں گزار دیں گے
ہم کہ جو زندگی بھر
اپنے حصّے کی روٹی کمانے کی کوشش کرتے ہیں
اور بھُوکے رہتے ہیں۔
جھُوٹی آس کی چھتری تلے
بُلبُلے جیسے آنسُو
بتاشوں کی طرح تھال میں سجائے
کب تک یہ بتلاتی رہو گی
کہ وہ تمہارا قاتل نہیں ہے
قتل محض ثانیے میں
زندگی کا رشتہ ختم کرنے کا نام نہیں
موجود سے انکار بھی
تو قتل کے مترادف ہوتا ہے۔

میرا جی کرتا ہے
وہ جو سب میرے قاتل ہیں
مَیں انہیں ہَوا کی طرح نگل جاؤں

# مَوت کا رَنج

سُنا تھا جنگ کے زمانے میں
دُھوپ بھی خُونی ہوتی ہے
ہمارے زمانے میں جنگ نہ تھی
مگر دُھوپ خُون روتی تھی
سڑکیں خنجر تھیں
کہ قاش در قاش
جسموں کے ڈھیروں پہ
امن کی سفید چادر ڈال دیا کرتی تھیں
قبر میں دماغوں کو دفن کرنے
اور مٹّی کھانے کے لیے

کہ گنے کی طرح

ہم اپنے بچپن کو چوس کر

زندگی میں مٹھاس گھولتے رہے ہیں

سائرن، ہمارے معاشرے کی آواز ہے

اور اندھے آئینے ہماری تصویر۔

عجیب الخلقت بچّے جننے والی ماؤں کی نسل

اہم لوگوں کے چہروں کی بےچہرگی بھی دیکھ رہی ہے

# آگ اور برف کے درمیان آنکھیں

یورپ کے شہر برف تلے دبے ہیں
اور میرا دل بھی ،
سُنا ہے وہاں لوگ ٹرینوں میں
پھنسے رہ گئے
تو اخباروں کی شہ سُرخیاں بنیں
ہم کہ یہاں بے جہت رواں ہیں
اور نہیں جانتے کہ کہاں جانا ہے
ہماری خبریں اخباروں میں کیوں نہیں آتی ہیں
مُردوں کی آنکھیں زندہ لوگوں کی بینائی تو بن رہی ہیں
مگر زندہ لوگوں کی زندہ آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں

سچ کو جھوٹ کی میزان میں تُلتے
کہ شہروں کو امن کے نام پر
لاشوں سے پٹتے۔
یقین کرو بارش نہیں ہوگی،
رحمت میرے رب کی
خبیث لوگوں کے لیے نہیں ہے

---

# دیپک راگ

جانے والے چلے جاتے ہیں
کبھی بُلاوے پہ
کبھی بن بُلائے۔
کہتے ہیں بن بُلائے جانے والے
نصیبے والے نہیں ہوتے ہیں
مگر وہ تو بڑا سوہنا
بڑا نصیبوں والا تھا
اُس کے بدن میں پیاس بھری تھی
اس کی آنکھوں میں بولتا دیپک راگ
سُلگ اُٹھا تھا

اس کا انگ انگ سلگ اُٹھا تھا
جہنّم کی آگ سے ڈرانے والوں نے
اس آگ کو گلزار بنانے کی دُعا کیوں نہیں کی
آتش پرستوں نے اِس آگ کو
سجدہ کیوں نہیں کیا
خواب میں آگ دیکھ کر تعبیر بتانے والوں نے
جاگتے میں آگ دیکھ کر تعبیر کیوں نہیں بتائی
مجھے بتاؤ
کیا لفظ بھی اُس کے ساتھ جھُلس کر مر گئے تھے!

# محاسبہ

جو تم نہیں سمجھتے وہ ازل ہے
اور جسے تم سمجھ کر انجان بننا چاہتے ہو
وہ ابد ہے۔
ستاروں کی گنتی کس نے کی
جس نے بھی کی، اُس کو
اپنے اندازے کے ستاروں کا عِلم ہُوا۔
عِلم کیا ہے
جب پوچھو آسمان نیلا کیوں ہے
سمندر نیلا کیوں ہے
گھاس کا رنگ گہرا سبز

اور کونپلوں کا رنگ ہلکا سبز کیوں ہے
تو کوئی اسے سائنسی مکاشفے کا نام دیتا ہے
تو کوئی قدرت کی صناعی کا۔
لوگ تو قبر میں چٹختی ہڈیوں کی آواز کو بھی
قدرت کا کرشمہ سمجھ لیتے ہیں۔
ذرّوں کی طرح گرتی برف
زمین کے وصال سے کس قدر سخت ہو جاتی ہے
ہم درخت تلے ہوں تو ہمارا سایہ
کتنے حصّوں میں بٹ جاتا ہے
ہم سب خواہشوں کے درختوں تلے
حصّوں میں بٹے ہوئے سائے ہیں۔
پچھلے برس کے کپڑے مجھے تنگ ہو گئے ہیں
اس وقت میرا سایہ میری گرفت میں تھا
ڈھیلی گرفت اور تنگ کپڑے
دیکھنا کہیں زمین بھی تو تنگ نہیں ہو رہی!

---

# تیسرے درجے والوں کی پہلی ضرورت

بولنا ہماری ضرورت ہے
چاہے زمین میں مُنہ دے کر ہی کیوں نہ بولنا پڑے ۔
میری بے گنہی زمین میں منہ دے کر
اپنی صفائی پیش کر رہی ہے
کہ زندگی کے سارے راستوں پر
قاضیٔ شہر کے فیصلے کے مطابق
خوف بچھایا جا چکا ہے ۔
بولنے والے ہمارے شہر میں کتنے رہ گئے ہیں
ان کے سر کاٹ کر واقعی سجا لینے چاہئیں
کہ پھر دیکھنے کو بھی ایسے لوگ نہیں ملیں گے

## خدا کی قسم

میری آنکھوں کی جگہ آبلے بھی لے لیں
تو بھی مَیں گریہ کروں گی
کہ میرے کھیتوں میں چیخیں اُگ رہی ہیں
میرے آنگنوں میں ٹھہری خاموشی
میرے بچّوں کی ہنسی لوٹ رہی ہے
میرا چپڑاسی وردی پہننے سے انکار کرتا ہے
کہ وردیاں تیسرے درجے کے شہری کی علامت بن چُکی ہیں۔
بات تو علامت سے بھی آگے نکل چکی ہے
چھپکلی کی کٹّی دُم کی علامت ہو کہ
بُوئے خوں کی علامت
اب سب خوف کے دوسرے نام ہیں
ہم لوگوں کو اپنے ہی وطن میں جلا وطن کر دیا گیا ہے
کہ ہم بے رُوح جاندار۔ قصدِ گویائی سے بھی منحرف ہیں

# "نائٹ میئر"

بکری، ذبح ہونے کا انتظار کرتی ہے
اور مَیں صُبح ہونے کا۔
کہ مَیں روز دفتر کی میز پر ذبح ہوتی ہوں
جھُوٹ بولنے کے لیے
یہی میری قیمت ہے۔
تازہ قبروں کی طرح، پاؤڈر سے لپے ہُوئے چہرے
مجھے ملنے آتے ہیں
ذہنوں کے قبرستان میں ایسی سجاوٹیں ہی
زیب دیتی ہیں
مَیں اور میرا وطن ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے

مگر دونوں کی بصارت بچپن ہی میں ماری گئی ۔
مَیں نے روٹی دیکھی نہیں
اپنے تصوّر میں اس کی شکل بناتی اور کھاتی ہوں
میرے بہت سے ہم عمر، روٹی صرف خواب میں دیکھتے ہیں ۔
میرے مُلک میں عورتیں پہلی کا چاند دیکھ کر دُعائیں مانگتی ہیں
اور باقی ساری دُعائیں اگلی پہلی کے لیے اُٹھا رکھتی ہیں ۔
دوسری شادی کے اجازت نامے پہ انگوٹھا لگانے کے بعد بھی
وہ پہلی کا چاند دیکھ کر دُعائیں مانگتی رہتی ہیں،
شاید ہم جیسے جھُوٹ بولنے والوں کی عاقبت سنوارنے کے لیے ۔
ہم اپنی جنگجُویانہ بہادری کے گُن گاتے ہیں
اور مکھّیاں ہم پر یلغار کرتی رہتی ہیں ۔
ہم اپنے قد سے لمبی تلوار کو اسلاف مانتے ہیں
اور ان کا زنگ اپنی زبانوں پر سجا لیتے ہیں
زنگ خوردہ زبانوں اور زمانوں میں زندگی کرنے والوں کا نام
دفتری بابُو ہوتا ہے ۔
جاننے والے کا ہر حساب غلط

اور آنے والے کا ہر حساب درست
زنگ خوردہ زبانیں ہی کہہ سکتی ہیں
اب تو تلوار بنانے والا آہن گر، یہ سمجھتا ہے
کہ فتح، وہ تحریر کرتا ہے

# کوکلا چھپائی

اندھیرے میں دیکھنے میں بڑا مزہ آتا ہے
اپنے اندازے کے مطابق
تصوّرات ڈھلتے، بڑھتے اور سنْورتے ہیں۔
اندھیرے میں چلنے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے
کسی بھی ٹھوکر کو انجانے میں کہہ کر
قابلِ معافی سمجھا جا سکتا ہے۔
اندھیرے میں رونے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے
ہنستے ہونٹوں اور روتی آنکھوں کا بہروپ
نہیں بھرنا پڑتا
ہاں سسکیوں کو قہقہوں کا آہنگ

دینا پڑتا ہے۔

اندھیرے میں بھاگنے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے
نہ گھبراہٹ عریاں ہوتی ہے
نہ خوف کا پردہ چاک ہوتا ہے
چڑھا ہُوا سانس، بیٹھتی جھاگ کی طرح
قطرہ قطرہ ماتھے سے گرتا ہے۔
اندھیرے میں ڈوبنے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے
زندگی سے ٹوٹتے رشتے کی آخری گرہ کھُلے
تو درختوں سے پرندے بھی ڈر کر اُڑ جاتے ہیں
میرے ہاتھوں پہ اندھیرے کی لکیریں
اندھیرے میں ہی پڑھ لو
روشنی جانتی ہے
کہ مَیلے ہاتھوں کے مقدّر، کتنے مَیلے ہوتے ہیں

---

# سونے سے پہلے ایک خیال

مجھے نومبر کی دُھوپ کی طرح مت چاہو
کہ اس میں ڈوبو تو تمازت میں نہا جاؤ
اور اس سے الگ ہو تو
ٹھنڈک کو پور پور میں اُترتا دیکھو۔
مجھے ساون کے بادل کی طرح مت چاہو
کہ اس کا سایہ، بہت گہرا
نس نس میں پیاس بجھانے والا
مگر اس کا وجود پل میں ہوا
پل میں پانی کا ڈھیر۔
مجھے شام کی شفق کی طرح مت چاہو

کہ آسمان کے قرمزی رنگوں کی طرح
میرے گال سُرخ
مگر لمحہ بھر بعد
ہجر میں نہا کر، رات سی مَیلی مَیلی۔
مجھے چلتی ہَوا کی طرح مت چاہو
کہ جس کے قیام سے دَم گُھٹتا ہے
اور جس کی تیز روی قدم اُکھیڑ دیتی ہے۔
مجھے ٹھہرے پانی کی طرح مت چاہو
کہ مَیں اس میں کنّول بن کے نہیں رہ سکتی ہوں
مجھے بس اتنا چاہو
کہ مجھ میں چاہے جانے کی خواہش جاگ اُٹھے!

# پیوند

یہ موسم کے سرد اور ویران دنوں کی بات ہے
تم نے میری عمر کی شاخ کی قلم کاٹی
اور ایسے لگایا
کہ وہ سرسبز، ہری بھری جھاڑی بن گئی۔
مگر تمہاری زبان کے ذائقے میں
میرے علاوہ اور کون شریک ہے
کہ میری زبان کبھی کبھی کڑوی ہو جاتی ہے۔
میں اپنی ٹھنڈی سانسوں کو
کئی دفعہ آزاد کرتی ہوں
کڑواہٹ سے آزاد ہونے کے لیے

شعلگی سے بچنے کے لیے
مگر مجھے یوں لگتا ہے
جیسے مَیں دریا میں ایک ٹانگ پر
کھڑی ہوں ، اور میری ایک آنکھ میں روشنی
اور ایک میں تاریکی ہے ۔
کچھ لوگ کہتے ہیں
تمھارے دانتوں پر برف کا گمان ہوتا ہے
کندن کا نہیں
تبھی تو ، خشک اور سرد ہَواؤں سے
جسم چٹخنے لگتا ہے
مگر تم نے تو
ایسے ہی چٹخنے موسم میں
میری عمر کی شاخ کی قلم لگائی تھی ۔

برف کے ٹوٹنے اور پگھلنے کا اگلا موسم
پھر آگیا

ذائقہ تحریر کرتے کرتے
ذائقے میں تحلیل ہونے کے دن
چاند کے بڑھنے کے دنوں میں
مجھے سکھا رہے ہیں ،
شام کی سیاہی کا پہلا عکس
خوش نما
اور صبح کی سیاہی کا آخری عکس
خوش کن ہوتا ہے
تم ان دونوں سیاہیوں کو
اپنے ہونٹوں میں لپیٹ لو
میرے ہونٹوں پر تمہارا ہاتھ
ساری سیاہیوں کو دھو دے گا

# سمندر کی پیاس کا بُلاوا

تم جب آتے ہو
تمہارے ہاتھ میں سفید پھُول ہوتے ہیں
میرے پیار کی گرمی انہیں سُرخ کر دیتی ہے
تم میرے دہکتے لفظوں سے ڈر جاتے ہو
بھلا آئینے میں آگ کا عکس بھی
خوف زدہ کر سکتا ہے
مَیں ہر روز اپنا کمرہ صاف کر کے
اور اپنے آپ کو سنبھال کے بیٹھتی ہُوں
کہ تم آؤ گے ۔
جب درختوں کے وصل سے مغلوب ہو کر

رات بھیگ کر سو جاتی ہے
مَیں بِھر کمرے کو بے ترتیب کر دیتی ہوں
مگر تم ہمیشہ کی طرح پُرسکون
ہاتھ میں سفید پھُول لیے
میرے اندر کے پت جھڑ سے بے خبر
رات اور دن کی ساری حلاوتوں کو سمیٹے
چلے آتے ہو، جب چاہتے ہو
اور مجھے، اس وقت، سمندر کی پیاس کا احساس ہوتا ہے۔
تمہیں معلوم ہے نا!
ساحل پہ رہ جانے والی جھاگ میں
تموج نہیں ہوتا ہے
میرے اندر کی مَوجیں
جب تمہیں پُکارا کریں
آجایا کرو
تم نے آسمان جیسا، بے وصال رنگ
میری موجوں میں پرو دیا ہے

تمہاری آنکھوں کی نیلاہٹ
میرا لباس ہے
مگر سُنو
میرے اندر کی موجیں جب تمہیں پُکارا کریں
آجایا کرو!

---

# زمین میری ہم عمر

جن زمینوں پر، ہر چیز مائل پرواز ہو
وہاں سے گزر کر جاؤ
تو پھر تمہیں قبرستان ملے گا
تم کیا جانو، یہ درخت، یہ پتھّر
یہ چٹانیں
تمہاری نسلوں سے پہلے
انسانوں جیسے ہی تو تھے
قبروں جیسے، دیکھنے آنے والوں کے منتظر
یہ پہاڑ، یہ پتھّر، دیکھتے ہیں،
مَیں لیٹوں تو یہ زمین میرے برابر کی لگتی ہے

اور جنگل میرے اندر سانس لیتے ہیں
پھر بھی مَیں
پتّھر جیسی، قبروں جیسی
اور سُوکھے پتّوں جیسی بن کے
سچ مُچ قبر نہ بن جاؤں

تم نے مُجھ سے مِلنے کا وعدہ کیا ہے
تم نے مُجھ سے مِلنے سے پہلے
وہ لفظ سیکھے جنہیں اڑن کھٹولہ بنا کے
جہانوں پار جایا جا سکتا ہے
پھر تم نے اپنے وجود کی کشتی
بحرِ مُراد میں ڈال دی
اتنے بھروسے کی تسبیح کہاں سے آئی
کہ اب مجھے تمہارے بنا
روشنی اور تاریکی میں تمیز کرنی نہیں آتی ہے
تم نے میرا انتظار

اپنی قوّتِ انتظار سے بڑھ کر کیا ہے
یہ درخت ، یہ پتّھر، یہ چٹانیں
تمہاری قوّت انتظار کے آئینے ہیں
ساحلوں پہ بکھرے سارے پتّھر
تمہارے انتظار کے لمحے سمجھ کر
میں نے جمع کر لیے ہیں
مَیں نے تمہارے سارے راز چکھ لیے ہیں

آؤ میری جانب
پرواز کرتے ہوئے آؤ
تمہاری اونچی چٹانوں پر
میرے سانسوں کے درخت
کتنے سرو قد لگ رہے ہیں
مَیں نیند میں بھی نیند کی کیفیت
کے خواب دیکھتی ہوں
اور اس وقت
مجھے زمین اپنے برابر کی لگتی ہے

# بہت سے قصّوں میں سے ایک قصّہ

کھانے کی میز پہ گرد پڑی تھی
مَیں نے اسے کھایا تو نہیں
البتہ اپنی انگلی سے
اس گرد سے وہ لکھ دیا
جو تم کو بتانے کا حوصلہ نہیں پاتی تھی

## زرد دائرہ

چراگاہوں سے پلٹتے ریوڑ
اور گھروں سے رخصت ہوتی دُلہنیں
ایک سا منظر ہوتا ہے۔
گلے میں بندھی ہُوئی گھنٹیاں زبان بن جاتی ہیں
گلے میں لٹکی گھنٹیاں اور چلتے پاؤں
میرے مولا! کیا ہم زندہ ہیں
شہد کی مکھیوں کے چھتّوں کی طرح
حُجلۂ عروسی
خوشیوں کے گیس چیمبرز بن جاتے ہیں۔

مرے رزق میں میرا ایمان شامل نہیں رہا

کہ میری اپنی آنکھ
خواب کچھ دیکھتی ہے اور بیان کچھ کرتی ہے

آنکھ مچولی کے اس موسم میں
تم مجھ سے مت ملنا
منہ پر ہاتھ رکھ کر اور انجان بن کر
مَیں تمہیں ڈھونڈنا نہیں چاہتی ہوں
مَیں نے تمہیں دیکھا ہے اور دیکھتے رہنا چاہتی ہوں ۔

آنکھ کا رُتبہ مرے خواب کی خواہش تھی
اب جب کہ میری بات ، مرے ہاتھ
سب خالی ہیں
ان کو شہرِ مُراد کا رستہ کون دکھلائے گا
مرے رزق میں میرے ایمان کو کون شامل کرے گا
کہ ہَوا کٹے ہُوئے پَروں کو اُڑنا نہیں سکھا سکتی
کہ ہَوا جاگتی آنکھ میں نیند کا رُتبہ نہیں پا سکتی ۔
مَیں شہر کی تاریکی کس رنگ میں ڈبو دوں

کہ میری آنکھوں کا یرقان دُھل جائے

کچّے ناریل کے چھُپے جسم کی طرح
تم رزق کی چٹانوں سے کب نکلو گے
کہ مَیں آنکھ مچولی میں ہاتھ لگ جانے والے شخص
کا مقدّر نہیں بننا چاہتی ہوں
کہ مَیں گلے میں بندھی ہُوئی گھنٹیوں کی زبان
بننا نہیں چاہتی ہوں
مَیں کیا بننا چاہتی ہوں
کہ چراگاہوں سے پلٹتے ریوڑ
اور گھروں سے رخصت ہوتی دُلہن
ایک سا منظر ہوتا ہے

---

# تاریخ اپنے آپ کو نہیں دُہراتی

کہتے ہیں
مائیکل اینجلو
ایک بوسے سے
جیتا جاگتا انسان بن گیا تھا
انسان بنانے کے لیے
آدمی کے سامنے
موت کا رقص کرو
کہ زہر کا پیالہ پیو
مگر وہ تو بوسہ لیتے ہی
پتھّر کا آدمی بن جاتا ہے

---

# ری اشورنس

مَیں اتنی بُزدل ہوں
کہ تمھارا نام نہیں لے سکتی
مَیں اتنی بہادر ہوں
کہ تمھارے تصوّر کو اپنے اندر آباد رکھتی ہوں
تمھارے وجود کو لفظوں میں تخلیق کرتی ہوں
اور ہنستی ہوں
تم بھی تو میری ہنسی کو وجود سمجھے تھے
وجود کہ جس کے اندر اُترو تو پتہ چلتا ہے
کہ کچُھ کچّے پھل
پکنے سے پہلے ہی گل جاتے ہیں

مُجھ سے مِلو تو پہلے
میرے اُن لمحوں سے مِلنا
کہ جن کی رفاقت نے
میرے آنسوؤں کو شبنمستان بنایا ہے
تم مجھے مِلو، بے خوف ہو کر
کہ مَیں تمہیں بھی وہاں چھپا کر رکھوں گی
جہاں مَیں اپنے وعدے چُھپا کر رکھتی ہوں

# تمثیلِ تمنّا

اُس کی ہتھیلی پہ لکھے
میرے ٹیلی فون کے نمبر پھیل گئے ہیں
لمس نے رنگ دُہرا کر دیا ہے
سب سے چھُپا کے لکھے گئے
ٹیلی فون کا نمبر
سب کے سامنے ہے
کہ اضطراب میں کھُلتی، بند ہوتی
ہتھیلی نے سبھا سجائی ہے۔
گرمی اور بڑھے گی
تو یہ نمبر بھی دُھل جائے گا

مگر کیا وہ نقش بھی
ایسا ہی ہے
جو اُس نے میرا ٹیلی فون نمبر
لکھنے سے پہلے
اپنے دل میں بنایا تھا
کیوں کہ اس کی آواز
اس کا دل ہے
وہ نہیں بولتا
وہ پہلو بدل کے
صرف لب کھولتا ہے
اور اس کا سانس
میرے وجود کے پاتال کو چھُو لیتا ہے۔

ریت پہ تصویر کے بنانے کے دن
تو صحرا نورروں کی قسمت میں
آتے ہی نہیں

مگر تشنگی کو
آنسوؤں سے بجھا لینا
ان کا مقدر ہوتا ہے۔
وہ ہتھیلی پہ لکھے
ٹیلی فون نمبر کو گھمائے گا
اور وصال کی چھاگل اُلٹ لے گا۔

وہ برف کی تہوں میں چھُپے
گھر میں ہے
اور مَیں کھُلے آسمان تلے
جلتی زمین کے سینے پر۔
مگر سارے موسم
ٹیلی فون کی لائنوں میں گھُل کر
مجھے ور مالا پہنا رہے ہیں

---

# بشارتوں کے لیے ایک نظم

درخت ، جنگلوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں
ستارے ، کہکشاؤں میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں
قطرے ، سمندر میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں
دیواریں گھروں میں
اور رونقیں بازاروں میں
ایک دوسرے سے بات کرتی ہیں
مَیں
اَدھ کھُلی کھڑکیوں کی اُدھوری بات
مَیں نہ قصّہ تھی ، جسے بیان کیا جا سکتا
نہ صدا تھی ، جسے سُنا جا سکتا

نہ روشنی تھی، جسے دیکھا جاسکتا
مَیں
تنہائی میں پر کھولنے والے
کبوتر کی طرح تھی
پرواز کے بعد پلٹنے والے راستے سے
مجھے کوئی سروکار نہ تھا
اور ابر پارے کی مانند
ہَوا سے رسم و راہ
صرف آوارہ خرامی تک تھی۔
مَیں
خوش ہوں، کہ تیری آگ میں جل رہی ہوں
خوش ہوں، کہ تیرے خیال سے پابستہ ہوں
خوش ہوں، کہ میری دشت نما راتیں
نخلستان کی مانند گُلفشاں ہیں
خوش ہوں، کہ میری بے کنار خصلت
ساحل کی آغوش میں عافیت کو جان گئی ہے

خوش ہوں، کہ تیرے وصال کے بعد
عشقِ بے زوال سے آشنا ہو جاؤں گی
اب کھڑکی بند کر دو!

---

# تحلیلِ نفسی

محبت مر بھی سکتی ہے
مجھے نہیں معلوم تھا
مجھے نہیں معلوم تھا

جب تک کہ مقابل کی میز پر بیٹھے

میرا دل
شاخ پر لٹکے لٹکے
سیب کی طرح
خاکستری اور مُردار
محسوس ہُوا
محبت مر بھی سکتی ہے

مجھے نہیں معلوم تھا
مجھے نہیں معلوم تھا
جب تک کہ مقابل کی میز پر بیٹھے
میری آنکھیں نہ بھر آئیں
نہ میرے گلے میں میری
آواز آنسو بن کر اٹکی
نہ میرے سینے پر میری
ہی اُنگلیاں برچھیاں بن کر لگیں
محبت مر بھی سکتی ہے
مجھے نہیں معلوم تھا
مجھے نہیں معلوم تھا
جب تک کہ مقابل کی میز پر بیٹھے
مجھے میرے ہونٹ
جو ایک زمانے میں
سانس کی طرح
تمہارے ہونٹوں سے پیوست ہوتے تھے

ایک ڈبے میں
بند تاش کے پتّوں
کی طرح۔
مجھے اپنی زبان
مشینی زبان لگی
جو تمہیں آگے بڑھنے سے روک رہی تھی
اور خود مجھے سمجھا رہی تھی
محبّت مر بھی سکتی۔ہے
مجھے نہیں معلوم تھا
مجھے نہیں معلوم تھا

---

# ڈوبتی آنکھوں کا رزمیہ

کل مَیں نے
رات کی خالی کالی بوتل توڑ ڈالی
اور اس کے ٹکڑے اپنے ہی بستر پہ پھینک دیے
اگلی صُبح
میرے بدن کی بوٹیاں
ان ٹکڑوں میں پیوست
میرے بستر پر مُسکرا رہی تھیں
آوازوں کی سوئیوں نے مجھے چھیدا ہُوا تھا
مَیں خود اپنے لیے یادداشت بن چُکی تھی۔
گھنٹی بجی

یہ میرے اندر کی نہیں، دروازے کی گھنٹی ہے
بھولنے والے کو یاد کرانے کے لیے
مگر بستر پر پڑی ہوئی بلّی کے پنجوں میں
چھُپے ہُوئے ناخنوں کی طرح
بوتل کی کرچیاں مجھے خود سے وابستہ رکھنے پر
مُصر ہیں ۔
ڈوبتے بدن سے بازو بغاوت کرتے ہیں
مگر باہر سے دھندلے شیشے کو ناک چپکا کر
بھی دیکھو تو کچُھ دکھائی نہیں دیتا ہے ۔
خلا میں لٹکے بازو تھک کر گر جائیں گے ۔
شام پڑتے ہی کُوچ کرتے پرندوں کے ساتھ جانے کو
اب میرا بھی جی کرتا ہے
مگر ان پرندوں کو تو اپنے بسیرے کا عِلم ہوتا ہے
مَیں کہاں جاؤں گی
بارش میں بھیگی سڑکوں پہ روشنیوں کا عکس
میری آنکھوں میں بھی تیر رہا ہے، تارِ عنکبوت کی طرح

دُھند اور سمندر، ایک ساتھ سانس لیتے ہیں
دُھندلی آنکھوں سے دُھند میں لپٹے سمندر کو دیکھو تو
وسعتیں بھی ہانپتی ہوئی نظر آتی ہیں۔
میرے اندر کا خلا
باہر کے خلا کو گھُور رہا ہے
گھنٹی بجتے ہی، خندۂ ناآشنائی
میرے ساتھ کمرے کے رنگ کو بھی زرد کر دیتا ہے۔
کپڑے بھی جاگ اُٹھتے ہیں
اور بدن کے سمندر کے باہر دُھند کو
وصل کی تمازت میں تحلیل کر دینا چاہتے ہیں۔
اب تم لڑکی نہیں ہو
جنگل کی سمت مت جاؤ
دن اپنی ساعتوں، عمارتوں اور خصلتوں کے ساتھ
طلوع ہوتا ہے

---

## مُجھ سے چھُپے رہو

میرے تمہارے درمیان لاتعلقی کا جنگل
پھیلتا جا رہا ہے
اپنی مدافعت میں گونگا بن کے بھی
چاند کے چہرے سے خون رِسنا بند نہیں ہُوا۔
سُنا ہے آسمان پر ہمکلام ہونے والے
میری زبان مانگ کر لے جایا کرتے تھے
کہ اس کی چاشنی میں
آسمانوں سے اُترتے حروف لپٹ لپٹ کر
آتے تھے
مگر اب تو خامشی کی قبر میں لیٹے لیٹے

چمنیوں سے نکلتے دُھوئیں کی طرح
میری انا اور میرا وجود تحلیل ہو چکا ہے
مقبروں کی طرح ویران
اور خوابوں کی طرح کھوکھلے
آنکھوں کے پٹ
پلکوں کے وصال سے بھی محروم ہیں
مَیں ہر جبر کے باوجود
تم نہ بن سکی
مگر تم نے مجھے
مُجھ سا بھی کہاں رہنے دیا ہے

# ایک نظم اجازتوں کے لیے

تم مجھے پہن سکتے ہو
کہ مَیں نے اپنے آپ کو
دُھلے ہُوئے کپڑے کی طرح
کئی دفعہ نچوڑا ہے
کئی دفعہ سُکھایا ہے
تم مجھے چبا سکتے ہو
کہ مَیں چوُسنے والی گولی کی طرح
اپنی مٹھاس کی تہہ گھُلا چکی ہوں
تم مجھے رُلا سکتے ہو
کہ مَیں نے اپنے آپ کو قتل کر کے

اپنے خون کو پانی پانی کر کے
آنکھوں میں جھیل بنا لی ہے
تم مجھے بھون سکتے ہو
کر میری بوٹی بوٹی
تڑپ تڑپ کر
زندگی کی ہر سانس کو
الوداع کہہ چکی ہے
تم مجھے مسل سکتے ہو
کر روٹی سوکھنے سے پہلے
خستہ ہو کر بھُر بھُری ہو جاتی ہے
تم مجھے تعویذ کی طرح
گھول کر پی جاؤ
تو مَیں کلیساؤں میں بجتی گھنٹیوں میں
اسی طرح طلوع ہوتی رہوں گی
جیسے گُلِ آفتاب!

---

# گود میں لحد

اب مَیں
سونے سے پہلے خود کو مار دیا کرتی ہُوں
کہ میرے اندر سوئی خواہشیں
مجھے سوتا دیکھ کر باہر نہ آجائیں
کہ میرے اندر ٹھہرے
قوّتِ برداشت کے سمندر
بپھر کر مجھے بہا نہ لے جائیں۔
یاد ہے :
مَیں نے تمہارے سگرٹوں کے بُجھے ٹکڑوں سے
اپنا وجود بنانے کی کوشش کی تھی

مسلے ہوئے ٹکڑوں سے
مسلا سا وجود بن تو گیا تھا
مگر اس میں آگ جیسی تپش دُور دُور تک نہیں تھی
پھر مَیں نے جوتوں کے گِھسے ہُوئے تلوں سے
اپنا وجود بنانے کی کوشش کی
یہ کام آسان بھی تھا
کہ ہر تلے پر میرے جسم کے کسی نہ کسی حصّے کا
نقش موجود تھا
مگر اس سارے وجود میں
کوئی حرکت، کوئی دھڑکن نہیں تھی
پھر مَیں نے اپنی آنکھوں کا پانی نچوڑ کر
دھنک بنانے کی کوشش کی
دھنک نے مجھ سے کہا
اپنی قاش قاش کو
میری طرح کماندار بنالو
کوڑے کے ڈھیر جیسے میرے وجود نے

اس خیال کو بھی خواب سمجھا
اور میں کمرے کی تنہائی ، پہن کر بیٹھ گئی

---

# سانس اور پھانس

مرنے والے کے اعزاز میں
دو منٹ کی خاموشی
اس کی عزّت و احترام کا اظہار ہے
مگر جیتے جی
ایک ہی گھر اور ایک ہی چھت کے تلے
عمر بھر کی خاموشی
کس کی تکریم کی نشانی بنتی ہے
ماچس کی تیلیوں کی طرح
آتش گیر مادّے کے باوصف
آپس میں بے چُون و چرا منسلک

بقائے باہمی ۔ کولڈ وار ۔ ڈپلومیسی
بارش سے بیٹھ جانے والی قبر
اور ہونٹوں سے جھڑ جانے والی بات میں
کوئی خاص فرق تو نہیں ہوتا ہے ۔
زیادہ دیر سوؤ تو خواب بھی
ساتھ چھوڑ جاتے ہیں
پانیوں میں چھُپے غیر آباد
جزیروں کی خبر کون لائے گا
اندھیروں نے تو دماغوں ، گھروں
اور شہروں پر ایسے تسلّط جمایا ہے
کہ روشنی کی کمر بھی دوہری ہو گئی ہے
روشنی اپنے آپ کو کہاں کہاں تقسیم کرے !

---

# بارھویں شب کا چاند

تمھارے خیالوں سے میرا کمرہ بھرا ہے
اور میَں تمھارے سانسوں میں سانس لے رہی ہوں
میرے ہاتھوں میں میخیں ٹھُکی ہیں
اور میرے پیَر بندھے ہیں
آسماں کا تیز دھار اُفق
میری آنکھوں کے منظر کو کاٹنا چاہتا ہے۔
کہتے ہیں پورے چاند کو گہن لگ جاتا ہے
مگر آج تو بارھویں شب ہے
پورے سے ذرا سا کم چاند!
گہن کا جوالا مُکھی کہیں اور پھٹے گا

مگر میخیں تو میرے ہاتھ میں ہیں
اور تنہائی میرے گھر میں۔
خواہش میرے اندر انگڑائی لیتے لیتے
مُردہ سی ہوگئی ہے۔
میرے آخری خواب میں مری آخری خواہش کا نوحہ تھا
اور اس وقت میرے ہونٹوں پر زہر کا رنگ۔
تم ایک رات سے اتنی ساری توقعات
کیوں وابستہ کرتی ہو!
خیالوں سے بھرے کمرے میں
تنہا کیسے ہوگئیں
شام بغیر کہے پیچھے سے چلی جاتی ہے
میرے اندر کوئی ہے جو یہ جانتا ہے

---

# ریل کی پٹڑیوں کے نیچے کٹی ہُوئی نظم

کورے کاغذ پہ بِن لکھے رشتے
مَیں نے پڑھ لیے ہیں
ہم تو بِن مانگے مِل جانے والوں میں سے ہیں۔
جُھنگے میں دیے گئے مال کی بھلا کیا قیمت!
رشتوں کے بہت سے نام ہیں
آخر قاتل و مقتول کا بھی تو رشتہ ہوتا ہے
میرے تمہارے رشتے میں
خون کی مہک اور جذبے کی ارزانی نہ تھی
وہ تو حرف کی پازیب بجاتا
زینہ زینہ لب تک پہنچتا تھا

کورے کاغذ

کورے جذبوں جیسے نہیں ہوتے ہیں
وہ تو جذبوں کے اجاڑ بن کی
خزاں آلود شاموں جیسے
اور طاقوں میں جلے دیپوں
سے کالی ہوئی دیوار جیسے ہوتے ہیں
کورے کاغذ
اور دُھلی ہوئی آنکھیں
کورے کاغذ
اور سوکھے ہونٹوں کے بوسے
کورے کاغذ
اور بستروں کی بے شکن چادروں کا اتصال۔
آخر زمانہ کورے بدن کی چاہت میں
اتنا بے چین کیوں ہو جاتا ہے
کیونکہ شہر میں پہلے داخل ہونے والے
کے گلے میں مالا پہنائی جاتی ہے

کہ درخت کا پہلا پھل
شگن کے طور پر تقسیم کیا جاتا ہے
کہ پہلا پیار
سن خوردہ اعصاب کا نوسٹیلجیا ہے۔
چابی کھو جائے
تو نئی چابی بازار سے بن جاتی ہے
زمین خشک ہو تو
نہر کا پانی سیراب کر دیتا ہے
آنکھیں جاتی رہیں
تو دوسروں کی آنکھیں لگا دی جاتی ہیں
جب ہر چیز کا بدل ممکن ہے
تو پھر انسان کا بدل کیوں ممکن نہیں
کہ ہم واپس اسی کی طرف لے جائے جائیں گے
چاہے ریل کی پٹڑیوں کے نیچے آن کر مریں
کہ کندھوں پر لے جائے جائیں
مگر کس کی طرف

کہ جس نے میرا مقدر
زندگی میں ریزہ ریزہ بکھرنا
اور مر کے بھی بوٹی بوٹی
ریل کی پٹڑیوں سے اُلجھنا لکھا ہے
وہ لوحِ محفوظ
اس کورے کاغذ کی طرح ہے
کہ جیسے آگ دکھاؤ
تو حرف روشن ہو جاتے ہیں
مَیں نے تمہارے کورے کاغذ کو بھی
دل کی آگ دکھائی
مگر اس برف نے پگھلنے سے انکار کر دیا

---

# مَیں اَور مَیں

مَیں کتابوں کے جنگلوں میں رہتی ہوں
کہ سبز شاخوں جیسی کتابیں
لفظ و معنی کے گھنیرے سائے میں
میرے وجود، میرے جسم کے الاؤ کو
سمیٹتی ہیں اور آسودہ کرتی ہیں
مَیں ایک اکیلی تو نہیں
میرے اندر کئی عورتیں قید ہیں

ایک وہ کہ جس نے نسلِ آدم کی
تخلیق کے سلسلے کو اپنے خُون سے
مربوط رکھا

مگر گھر میں سب کا بچا ہُوا کھا کر
رب کا شکر ادا کیا

ایک وہ کہ جس نے مرد کی دُنیا میں
دخیل ہو کر
آمنے سامنے اور آگے پیچھے کے
سارے بوجھ اُٹھا کر
اپنے لیے اور زمانے کے لیے
خوف کی دیوار کھڑی کی
اور شبہے کی دُھول اُڑا دی

ایک وہ کہ جس نے اپنے وجود کے غازے سے
زندگی کو آبدار کیا
اور تحیّر میں پلٹے زمانے نے
آغوش وَا کیے اُس کا انتظار کیا

ایک وہ کہ جس نے
[illegible]

نورجہاں بننے سے انکار کیا
ممتاز محل بننے سے انکار کیا
جس نے قرۃ العین کی طرح
اپنے لب آزاد رکھے
مگر اس سے پہلے کہ اُسے
بال باندھ کر زمین پر گھسیٹا جاتا
اُس نے خود ہی بال کٹوا دِیے

ایک وہ کہ جس نے
دنوں میں بہادری
اور راتوں میں بُزدلی کی کہانیاں
تحریر کیں
جس نے اندھیروں میں
مٹھیاں بھینچیں
اور روشنیوں میں
خود چراغ بن کر آویزاں ہوئی

ایک وہ کہ جس نے
معشوق کے ملبوس کو ترک کیا
آپے رانجھا ہوئی
خوابوں کی بشارت نہیں مانی
اور سرگوشیوں کو شہرِ ممنوع
کی زبان سمجھا

ایک وہ جو اب تک
کوئلے سے چلنے والے انجن کی طرح
پانی پیتی اور دُھواں اُگلتی ہے
یہ چلی جا رہی ہے، یہ چلی جا رہی ہے

# دوسری پیدائش

عورت نے دہلیز کی خاک بن کے جینا سیکھا
تو مرد نے کوٹھے پہ تنے لہریا دوپٹوں سے ،
جھانکتی دھانی بانکوں سے اپنا رشتہ جوڑا
عورت نے مُنہ میں گھنگھنیاں ڈال کے
زندگی کرنے کا عہد کیا
تو مرد نے باتوں کے شگوفوں اور قہقہوں
کے فوّاروں میں
اپنے آپ کو بھگونے کو
سوسو کوس کی مسافت کاٹی
اور خاموش پجارن کے قدموں میں

تنہائیوں کے طوفانوں کے رُخ موڑ دیے۔
گھر میں بیٹھی عورت صُبح کاتتی رہی
اور کوٹھے پہ بیٹھی عورت صُبح چھانتی رہی۔
عورت نے دہلیز پار کی
کہ خون تھُوکتے تھُوکتے
اُس کی آنکھوں میں بھی خون اُتر آیا تھا۔
شہر میں ہر چیز کی قیمت تھی
تنہائی کی بھی قیمت تھی۔
رونق بہت تھی
دھکم پیل میں پَیر چھلے جاتے تھے۔
خاکستری رنگ
نارنجی رخساروں میں ڈھلا
خوف کی دیوار گری
اور یقین کے لہلہاتے کھیت میں
آنکھوں کے خوشے چمکنے لگے۔
صُبح کاتنے والی

فصل کاٹ رہی تھی

مگر پھر اکیلی تھی

کہ اب مرد

گھر بیٹھنے والی، معصوم بے شعور کی تلاش میں

مئے بدمست تھا

# ایک کہانی

کاٹھ کے گھوڑے پہ بیٹھ کے
بچّہ ہلکورے لیتا ہے
گھوڑا لکڑی کا ہے
لمس نا آشنا ہے
وہ بے جان کو خوب مارتا ہے
خوب اُلٹا سیدھا کرتا ہے
اور خوش رہتا ہے
جوان ہوتا ہے
پھر کاٹھ کے گھوڑے پہ سوار ہوتا ہے
اور نفیریاں بجوا کر اپنے جوان ہونے کا اعلان کرتا ہے

رات گزرتے ہی کاٹھ کا گھوڑا بدل جاتا ہے

مارنے والا اور خوش ہونے والا، وہی رہتا ہے

ہمارا تمہارا مجازی خُدا

# مَیں ـــــ ایک اور

غصّے میں بڑبڑانے کی عادت
بچپن سے تھی
یہی عادت سوتے میں
دانت پیسنے میں منتقل ہو گئی
یہی عادت جاگتے میں
ہونٹ کاٹنے میں منتقل ہو گئی
جذبے، آواز میں منتقل ہونے سے ڈریں
تو رگوں کا زہر بن کر
ثمر آور قوّتوں کو مفلوج کر دیتے ہیں
گھنے درختوں کے بیچ بھی سُورج جھانک لیتا ہے

کبھی تم بھی جھانکو
کہ میں اب سوتے میں مسکرانا چاہتی ہوں
لمبی گھاس میں بارش اپنا آپ چھپا لیتی ہے
آؤ! میں تمہیں چھپا لوں گی
کلائی پہ بندھی گھڑی کی طرح
کوئی نشان میرے جسم پہ نہ چھوڑنا
کہ میں آنکھوں کی سلاخوں سے
پہلے ہی بہت زخم زخم ہوں
مرے دل اور مرے ہونٹ جاگنا چاہتے ہیں
اپنی تجسیم بادلوں میں مرتسم کرو
کہ بے اعتبار ساعتوں کا موسم گزر چکا ہے

# انٹی کلاک وائز

میری آنکھیں، تمہارے تلوے بھی بن جائیں
تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ مَیں دیکھ تو نہیں سکتی
جسموں اور فقروں کو
خُوشبو کی طرح محسوس تو کر سکتی ہُوں

میری ناک، اپنے تحفّظ کی خاطر
تمہارے سامنے رگڑ رگڑ کر
بے نشان بھی ہو جائے

تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ مَیں سونگھ تو نہیں سکتی
مگر کچھ بول تو سکتی ہوں

مرے ہونٹ ، تمہاری مجازیت کے گُن
گا گا کر
خشک اور بے رُوح ہو بھی جائیں
تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ مَیں بول تو نہیں سکتی
مگر چل تو سکتی ہُوں

مرے پیَروں میں زوجیت
اور شرم و حیا کی بیڑیاں ڈال کر
مجھے مفلوج کر کے بھی
تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ مَیں چل تو نہیں سکتی

## مگر سوچ تو سکتی ہوں

آزاد رہنے ، زندہ رہنے
اور مرے سوچنے کا خوف
تمہیں، کن کن بلاؤں میں گرفتار کرے گا

---

# پرسونا I

آسمان کے بوڑھے ستارے
اور پہاڑ کی چوٹیوں پہ کھڑے
درختوں کے بے امان تنے
صدیوں کا صبر اپنے سینے میں دبائے
مُنہ بند تنوّر کی طرح
بے زبان سے نظر آتے ہیں
جس لکڑی سے کشتی بنتی ہے
اس کو پانی پسند نہیں
مگر ساتھ رہنے کے لیے
پسند کا مسئلہ ثانوی ہو جاتا ہے۔

مرے بغیر، مُردوں کی طرح زندگی گزارنے کا عمل
تمہارے جُوتوں کے پنجوں کی اُڑی کھال پہ
پڑی گرد سے ظاہر ہوتا ہے۔
انگیوں کے سہارے ڈھلکی چھاتیوں کو
رُوپ نہیں ملتا ہے۔
کُند چھُری اور بیٹھی مٹّی جیسے
نمی خوردہ بدن پہ
بُزدلی کی نیلی رگیں اُبھر آئی ہیں۔
دو ترچھی لائنوں کا اتصالی نقطہ
مبہم رشتوں کو منطقی ثابت کرنے کا
مجہولی عمل۔
وہ پروٹیکٹر بنا
اتصالی نقطے کے گرد حصار کھینچتا رہا
اور مرے وجود سے انکار کی لائن گہری ہوتی چلی گئی۔
غار اور قبر میں کیا فرق ہوتا ہے
ایک قدرتی اور ایک ارادی

ارادی منصوبے اپنا ماضی رکھتے ہیں
اور مستقبل بھی۔
تنہائی سیلن کی طرح
مرے وجود کے اندر سرایت کرتی چلی جا رہی ہے۔
مَیں کیا دھند میں پیدا ہوئی تھی
کہ میرے اندر ہر عکس، ہر رشتہ
اور ہر جذبہ دھندلا ہے۔
جیل کے قیدی نے کبھی رات کا آسمان نہیں دیکھا
اور سُورج نے کبھی رات نہیں دیکھی
مَیں نے دن نہیں دیکھا
مَیں نہ قیدی ہوں اور نہ سُورج
مَیں تو بچپن میں
بڑے بہن بھائیوں کے پُرانے کپڑے
پہنا کرتی تھی
اور تجربوں کی جھریوں کے اِس زمانے میں
یادگار لمحوں کے سنبھالے ہوئے کپڑوں کو

تھوں سے اُڑی رنگتوں کے باوجود
کھول کھول کر پہن رہی ہوں
میری آنتوں کی رسیاں بنا کر
اور جھُولا جھُولو
کہ مَیں نے اپنی زبان کا تنوّر
بند کر دیا ہے

---

## پرسونا II

رشتوں کی آبجو میں کوئی گہرائی نہیں ہوتی ہے
مگر پھر بھی سرنگوں جیسے رابطوں سے
آگے کی منزل کی تلاش میں
ہم ایک دوسرے کے لیے بے چین رہتے ہیں
مجھے معلوم ہے
باپوں کے جنگل میں ایک درخت کا نام
مرا باپ تھا
اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر
گزرتی ہواؤں کو دیکھو، تو سوچو
انھی میں سے کسی کا نام میری ماں تھا

کہ بغیر پتہ لکھے خط، بالکل ایک جیسے لگتے ہیں
مَیں، اپنے سب سے سہانے خوابوں میں بھی
ایسے پتھّر پہ کھڑی نظر آتی ہوں
کہ جس کے نیچے میرا دل ہے۔
میرے زخموں میں سے جھانک کر
خُدا دُنیا کو دیکھتا ہے
اس دُنیا کو کہ جہاں لوگ
کھڑے ہوتے ہیں تو کھانے کے لیے
اور بیٹھتے ہیں تو مرنے کے لیے۔
تلخ لہجے میں کہے ہوئے شیریں لفظ
اور بھی تلخ ہو جاتے ہیں۔
میرا جی کرتا ہے
مَیں وقت بن جاؤں
اور تم کائنات
یوں تو تم میرے ساتھ چلو گے
وقت سے بچھڑے ہوئے زمانوں کی

بہاریں نہیں ملتی ہیں۔
سوکھی گھاس کہ جسے کوئی بھی
چنگاری بھسم کر سکتی ہے
تمہارا آنگن کیوں بنے۔
آؤ بارش کا پہناوا پہنیں
شاید یونہی نکھر جائیں
مگر کیسے کہ ہم تو خواب میں بھی
خواب دیکھنے والوں جیسے نہیں ہوتے ہیں۔
مجھ جیسے وقت میں
اور تم جیسی کائنات میں تو
خاموشی بھی بولتی ہے۔
ہم کہاں جائیں کہ سنّاٹے کی گونج
ہمارے کڑھے ہوئے کرتوں کے نیچے
چھپے زخموں کو آشکارا کر رہی ہے
وہ سارے رنگ کہ جنہیں میں
خوابوں اور کھلی آنکھوں دیکھتی ہوں

میری مدد نہیں کر سکتے

میری آنکھیں بوڑھے وحشی درندے کی

آنکھوں کی طرح کھُلی بھی ہیں

تو کیا فرق پڑتا ہے ۔

کسی شخص کی ہذیانی ہنسی کو

ایک سنجیدہ کُتّا ، اسی طرح حیران ہو کر دیکھتا ہے ۔

# خود احتسابی

جب آخری مرغ کی آخری آواز آئے گی
جب ستارۂ سحری، آخری رات کے سفر
کے اختتام کا اعلان کرے گا
اور آخری دن کا سُورج
خُون تھُوکتی صُبح کا پیغام لے کر آئے گا
مَیں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر
اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

جب آخری سیاست دان، آخری آدمی کو بھی
قتل کر دے گا

جب آخری بچّہ بھی چاول کے ایک دانے کی
تلاش میں بلک بلک کر مر جائے گا
جب آخری قطرۂ خون بھی
مادرِ وطن کے تحفظ میں صرف ہو جائے گا
جب دُعا کا آخری حرف بھی ختم ہو جائے گا
جب آخری گولی بھی سینے کے پار اُتر جائے گی
مَیں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر
اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

جب آخری بچّہ، آخری لاش کے سوکھے پستان
کو چھوڑے گا
جب یتیم بچّہ بھی اپنی ماں کا نام لے کر
فرماں رواؤں کو کوسے گا
جب انسان، آخری قدم، آخری چاند
پہ رکھے گا
مَیں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر

اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

جب آخری بوسہ ، زندگی رقم کرے گا
جب نسلیں اپنے خوف کو لذّت سمجھ کر
برداشت کرنا سیکھ لیں گی
اور خلا بھی تصنّع کی تصویر ہو گا
مَیں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر
اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

# پورٹریٹ ۱۹۸۰

موسم بدلنے کی رُت میرے اندر نہیں آتی ہے
مَیں تو سمندر کی موجوں کے
پُرسکون ہو جانے کے وقت
ساحل کی سمت جاتی ہوں
شاید اس لیے آگ میری زبان کی ساتھی ہے
اور مَیں دوستوں کی رُخصتی کا نوحہ
ویسے تو، ہر نیا اندوہ، گزشتہ کی تجدید ہی کرتا ہے
مگر، پھر بھی نیا لگتا ہے
بالکل ایسے، جیسے اک نیا دوست!

اتنے مہین ملے کہ جن کے آر پار

ایک سا دکھائی دے

تعلّق کی عمریں سنبھالے ہوتے ہیں
گلاب کا رنگ میرے چہرے پہ نہیں ٹھہرتا
اور میری زبان کی سُرخی
لال پنسل سے بنی لگتی ہے
کہ موسم بدلنے کی رُت، میرے اندر نہیں آتی ہے

---

افزونی

# گُنار ایکلوف کی نظمیں

(۱)

اپنے خوابوں میں مَیں نے ایک آواز سُنی
حبیب! کیا تمہیں یہ پیاز پسند ہے
یا پھر اس کا ایک ٹکڑا ہی تم لو گے
یہ سُن کر مَیں مضطرب ہو گیا
یہ جلا دینے والا سوال ہی تو
میری زندگی کا سوال تھا
کیا مَیں کُل پر جُزو کو فوقیت دیتا ہوں
یا پھر کُل کو جُزو پر
نہیں مَیں چاہتا ہوں کہ دونوں پر میرا اختیار ہو
کُل کے سارے اجزا بھی میرے

اور کُل بھی میرا

اور یہی خواہش ہے جو تضاد سے پاک ہے

(۲)

مَیں تم سے مخاطب ہوں

مَیں تمہارے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں

اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے

مجھے معلوم ہے کہ تم جواب نہیں دیتی ہو

تم جواب بھی کیسے دے سکتی ہو

جبکہ اتنے سارے لوگ تمہارے مشتاق ہو کر

نوحہ خواں ہوں

مَیں تم سے صرف اس اجازت کا طلبگار ہوں

کہ تم مجھے یہاں کھڑے ہو کر انتظار کرنے کی اجازت دے دو

وہ انتظار جو میرے اندر سے ہی

تمہارے وجود کا اعلان کرے گا

(۳)

کچھ نہیں

تم اے مہربان اور نرم رو
تم وہ ہو جو مرد کے ہاتھ تلے اُوپر
توازن کے لیے رکھتی ہو
تمہاری اُنگلیوں کے پوروں میں شگوفے کِھلتے ہیں
میرے سارے ہوش و حواس کو سانس کی طرح
چُھو کر جان جاتی ہو
تمہاری جِلد، تمہاری آواز اور تمہاری محبتوں کی خوشبو
تمہارے وجود سے زیادہ مسحُور کُن ہے

(۴)

مَیں تمہارے حمائل بازوؤں کی گرمی کو محسوس کرتا ہُوں
یہ بازو دکھائی نہیں دیتے مگر موجود ہوتے ہیں
تم نے مجُھے اپنی ایک چھاتی کو چُومنے کی اجازت دے دی
وہ چھاتی جو دِل کے اُوپر تھی
پھر میری پلکیں چُوم کر تم چلی گئیں

(۵)

مَیں تمہارا باطن، ظاہر میں دیکھنا چاہتا ہوں

کیا یہ سُرخ تھا یا سفید
مجھے تم اپنا باطن، ظاہر میں دکھلاؤ
کیا یہ سفید ہے یا سُرخ
ظاہر میں، کیا تم دلیر ہو
باطن میں، کیا تم دلیر ہو
بتاؤ تم کونسا سوانگ بھرتی ہو
تم خود کو اتنا سُرخ اور اتنا سفید کیسے بناتی ہو
کہ تمہارے رُخسار اتنے خُوبصورت لگیں
تمہارے پاؤں ننّھے ننّھے معلوم ہوں
اور اگر پاؤں ننگے ہوں تو
تمہارے پھُولوں سے لدے لباس کے نیچے سانس لیتے دکھائی دیں

(۶)

صبر و تسلّی کی ملکہ
تم وہ ہو کہ جس کے ساتھ کوئی نہیں
تم وہ ہو کہ جسے کسی کا انتظار نہیں
تم وہ ہو کہ جس کا معصوم چہرہ
کمبل میں سے جھانکتا ہے

تم وہ ہو کہ جس کے پاس سب کچھ ہے
تم وہ ہو کہ جو سب کی ماں ہے
تم وہ ہو کہ جس کی چھاتیاں
سارے عالم کے لیے بھری ہوئی ہیں
تم وہ صرف تم ہو
تم وہ کہ جو تمام آدمیوں کے خوف کی ریکھا ہو
تم وہ ہو کہ جو سب کے لیے ، سب کے لیے ہو

۷

سڑک پر چلتے چلتے ، ہماری گفتگو
پیاس اور پانی کا رشتہ
مجھے اپنی جوانی کے مہکتے دن
یاد آ جاتے ہیں
مَیں نے اپنے آپ سے کہا
پچاس سال کی خود شناسی
اور خود تشکیک کے بعد
مَیں ایک پَر کٹی چڑیا کی طرح
لاچار ہو گیا ہوں

مجھے اپنا آپ دیکھ کر
پانی کے دو دھاروں کے درمیان
بے آباد سڑک یاد آ رہی ہے
ہاں ....... نہیں
اور تمہیں یاد ہے
ہم نے اپنے اونٹ کیسے پہاڑوں کے اُوپر
چڑھائے اور اُتارے تھے
اور مَیں نے کیسے میدان میں ان کے لیے
آگ روشن کی تھی
مَیں نے شجرِ نیستی
اور شجرِ ہمہ اوست سے
باہم شاخیں رگڑی تھیں

⑧

ہاں ! مجُھے معلوم ہے
تم نے مجُھے کس قیمت پر بیچا تھا
میری بولی مَوت جیسی اونچی قیمت لگی تھی
مَوت کے دروازے کے اندر

آئینہ خانۂ عالم میں

مَیں اپنے آپ سے

اپنے بچّے کی طرح ملوں گی

وہ گانا گاتے ہوئے

کہ جو تم نے مجھے سکھایا تھا

اُس خوب صورتی ، اُن کہانیوں

دُور بین نظروں اور پوتر دودھ کے ساتھ

اپنی رضاعی ماں کے پسینے کی خوشبو کے ساتھ

اس کی آغوش میں ـــــــ تحفظ کی مہک لیے

(۹)

پیدائش بہت سادہ سی بات ہے

تم ، تم بن جاتے ہو

موت بہت سادہ سی بات ہے

تم ، تم نہیں رہتے ہو

اس کے بالکل برعکس بھی ہو سکتا تھا

اس آئینہ خانۂ دُنیا میں

یوں بھی تو ہو سکتا تھا

کہ موت تمہیں پیدا کرتی
اور زندگی تمہیں خاکستر کر دیتی
دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ درست ہیں
اور شاید یہی دستورِ حیات ہے
تم مَوت کی گود سے اُبھرے ہو
اور زندگی تمہیں نابود کر رہی ہے

(۱۰)

تم اپنے غموں اور خوشیوں کے خود شاہد ہو
تمہارا اپنا آئینہ
اور آئینے میں تمہارا اپنا تصور
ایک دوسرے میں عاشقوں کی طرح
یک جان ہوتے نظر آتے ہیں
جہاں عفریت سے لڑتے شاہزادے کی
آواز کا گزر نہیں ہو سکتا ہے
تم اور تمہارے درمیان
خاموشی راج کرتی ہے

ابدی خاموشی، عامل و معمول کی
عظمت و عرفان کی
وہ تمہاری ذات کا عشق
جو خود غرضی اور خود ستائی نہیں
بلکہ آئینہ نگری ہے

(۱۱)

مَیں ایک سیاہ عورت ہوں
میری گود میں ایک سفید بچّہ ہے
سو جاؤ، راج دُلارے سو جاؤ
مگر تم کسی صورت نہیں مانتے ہو
کیا تمہیں دودھ چاہیے
سو جاؤ ——— سو جاؤ
مَیں تمہارے لیے روتی ہوں
سفید بچّہ مر رہا ہے
سفید بچّہ مر گیا ہے
میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا

سفید بچّہ دودھ بھی مُنہ میں لینا نہیں چاہتا
مَیں تمہیں اپنے پیٹ سے لگا کر گرم کروں گی
مَیں تمہیں اپنی گود کا جھولا جھُلاؤں گی
مَیں تمہاری آنکھیں باری باری چُوموں گی
یہ دیکھنے کو شاید تم یونہی آنکھیں کھولو
میری سمجھ میں کچھُ نہیں آتا
یہ بچّہ مرچُکا ہے
مَیں بھولی بھالی عورت
اس سفید بچّے کا اب کیا کروں
مجھے تو اسے دفن کرنے کا بھی اختیار نہیں ہے
چل بھاگ کُتّے کہیں کے
تُو کچھ نہیں جانتا

---